نیاز اختر
بوڑھے برگد کا انت

بوڑھے برگد کا انت ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے۔ وہ چھوٹے چھوٹے حادثات وواقعات، نیز سیاسی، سماجی، ثقافتی اور نفسیاتی مسائل کی کوکھ سے نئے موضوعات اخذ کر کے کچھ اس ہنر مندی سے افسانوی فریم میں فٹ کرتے ہیں کہ قاری عش عش کر اٹھتا ہے۔ ان کے افسانوں میں زندگی کے تمام رنگ موجود ہیں۔ موضوعات کی یہی رنگارنگی اور برتنے کے انوکھے انداز نے انہیں معاصر افسانہ نگاروں میں ممتاز کر دیا ہے۔

نیاز اختر نے افسانہ ''روح کا سفر'' (سہ ماہی ''صدف'' ۱۹۸۵) سے افسانہ نگاری کی شروعات کی۔ اب تک چالیس سے زائد افسانے اردو کے اہم رسائل آجکل، ایوان اردو، شاعر، ادب ساز، بانو، بیسویں صدی، اور کسوٹی جدید وغیرہ میں شائع ہو چکے ہیں۔ وہ افسانے کے نشیب وفراز سے بخوبی واقف ہیں۔ ان کے افسانے کا خاص وصف خود کو پڑھوا لینے کی صلاحیت ہے۔ خوبصورت اسلوب، برجستہ مکالمے، موقع ومحل محاورے، دلکش منظر کشی، اور تشبیہ و استعارے، ان کے یہاں افسانے کی ایک ایسی دنیا آباد کرتے ہیں کہ پڑھتے وقت قاری خود کو اس دنیا کا جیتا جاگتا کردار سمجھنے لگتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ گدھ، بوڑھے برگد کا انت، رنجنی، ٹرمینیٹر، اپرینٹس اور گرہن جیسے افسانوی دنیا کی سیر کرنے کے بعد قاری اس کے سحر میں ڈوب کر رہ جاتا ہے۔

عصر حاضر کے فکشن نقادوں تک جب 'بوڑھے برگد کا انت' پہنچے گا تو یہ نہ 'بوڑھے' کا، نہ 'برگد' کا اور نہ 'افسانے' کا انت ہوگا، بلکہ یہاں سے ایک نئے افسانوی سفر کی شروعات ہوگی، اور اس سفر کا جب 'انت' ہوگا تو نیاز اختر کو اس 'برگد' کے نیچے بیٹھنے کے طفیل میں 'نروان' حاصل ہو چکا ہوگا۔ اس وقت منفرد اسلوب، علاقائی مکالمے، نادر پیشکش اور انوکھے ٹریٹمنٹ کی مقناطیسی کشش کے باعث ان کے افسانوی فن سے منہ موڑنا کسی کے لئے بھی آسان نہیں ہوگا۔ مجھے ان سے بہت ساری توقعات ہیں۔ یقیناً نیاز اختر کل فکشن کی نئی آبرو ہوگا۔

ڈاکٹر اختر آزاد

۱۹/اکتوبر ۲۰۱۱

بوڑھے برگد کا اَنت

افسانوی مجموعہ

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۶

Budhey Bargad Ka Ant
(A short stories collection)
by: NIYAZ AKHTAR
Compiled by: Prof. Ahmad Badr
Year of publication : 2013
ISBN 978-93-5073-132-1
Price : Rs. 200/-

نام کتاب	:	بوڑھے برگد کا انت
مصنف	:	نیاز اختر
مرتب	:	پروفیسر احمد بدر
سن اشاعت	:	۲۰۱۳ء
تعداد اشاعت	:	پانچ سو (۵۰۰)
قیمت	:	۲۰۰/روپے
کمپوزنگ	:	تنویر اختر رومانی
سرورق	:	مہتاب عالم پرویز
مطبع	:	عفیف پرنٹرس، دہلی۔۶

Published by
EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE
3108, Vakil Street, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6 (INDIA)
Ph: 23214465, 23216162, Fax: 0091-11-23211540
E-mail: info@ephbooks.com,ephdelhi@yahoo.com
Website: www.ephbooks.com

انتساب

دادا جان

نسیم الدین (مرحوم)

اور

ابا جان

عبدالقدوس (مرحوم)

کے نام

جن کی دعاؤں اور شفقتوں نے

مجھے اس لائق بنایا کہ

میرا قلم

عوامی مسائل کو افسانوی پیراہن

عطا کرنے میں کامیاب ہے!

مختصر تعارف

نام : محمد نیاز اختر

قلمی نام : نیاز اختر

تاریخ پیدائش : ۳۱ر دسمبر ۱۹۶۵ء

مقامِ پیدائش : شاہ نگر، سورج گڑھا، لکھی سرائے (بہار)

والد کا نام : (مرحوم) عبدالقدوس

والدہ کا نام : (مرحومہ) مہر النساء

تعلیم : ایم اے (تواریخ)

پہلی کہانی : 'روح کا سفر' مطبوعہ سہ ماہی 'صدف'، بھاگلپور (جنوری تا مارچ ۱۹۸۵ء)

گھر جنت : عصمت آرا (اہلیہ)

مہ وش نیاز (دختر)

ماہ رخ (دختر)

فراز اختر (فرزند)

ملازمت : ایس۔ڈی۔او۔آفس، جمشید پور میں بطور اردو مترجم

پتہ : 306، ٹی۔خان کمپلکس، چونا شاہ کالونی، نزد گاندھی میدان،
آزاد نگر، مانگو، جمشید پور۔832110 (جھارکھنڈ)

رابطہ : فون نمبر: 09431398553

E-mail: niyazakhtar40@gmail.com

مشمولات

نیاز اختر کی کہانی	ڈاکٹر کوثر مظہری	7
نیاز اختر کے افسانے: ایک جائزہ	منظر کلیم	10
باتیں اپنی	نیاز اختر	18

افسانے

۱۔ گدھ 21

۲۔ رنتھی 26

۳۔ اپرینٹس 33

۴۔ ٹرمینیٹر 38

۵۔ بوڑھے برگد کا انت 41

۶۔ حقیقت 46

۷۔ افعی 49

۸۔ اپنی اپنی صلیب 51

۹۔ مراجعت 55

۱۰۔ گرتوں کو تھام لے ساقی 58

۱۱۔ رفو میاں 64

۱۲۔ چھوٹی بہو 68

۱۳۔ کھرنڈ 75

۱۴۔ سنبھالا 79
۱۵۔ ہڑتال 85
۱۶۔ ڈوبتا سورج 89
۱۷۔ دل کی پھانس 96
۱۸۔ داغ داغ اجالا 101
۱۹۔ آزادی 105
۲۰۔ تپتی زندگی 107
۲۱۔ گرہن 110
۲۲۔ نروان 116
۲۳۔ کتا 120
۲۴۔ قاتل مسیحا 124
۲۵۔ روح کا سفر 129
۲۶۔ ہوئے تم دوست جس کے..... 131
☆ ان کی نظر میں 135

نیاز اختر کی کہانی

ڈاکٹر کوثر مظہری

شعبہ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی

■ انسانی زندگی کہانیوں کا خزانہ رکھتی ہے۔ ہم جہاں اور جس معاشرے میں رہتے ہیں، کہانی وہیں ہوتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ عام لوگوں کی نگاہوں سے یہ کہانیاں دور یا اوجھل ہوتی ہیں۔ ایک فکشن نگار کی نگاہیں ان کہانیوں کو ڈھونڈ نکالتی ہیں۔

نیاز اختر نے جو بھی کہانیاں لکھی ہیں وہ ہماری اپنی زندگی سے ماخوذ ہیں۔ اپنے تجربے اور مشاہدے کی بنیاد پر وہ کہانیاں لکھتے ہیں۔ کردار بھی جیتے جاگتے ہیں۔ ایسا اس لیے ہے کہ وہ اپنے Locale اور تہذیبی سیاق سے خود کو الگ نہیں رکھتے۔ 'تپتی زندگی' میں پانی کے Crisis کو ظاہر کرنے والا حد درجہ پھٹا حال بوڑھا ہو یا 'مراجعت' کا مضطرب اور بے چین کردار 'میں'، نیاز اختر ایک نازک موڑ پر کھڑے ہو کر ان واقعات کا مشاہدہ حیرت و استعجاب کے ساتھ کرتے ہیں۔ پانی کے لئے لائن لگی ہوئی ہے۔ بوڑھا فقیر آ کر اپنے کمنڈل میں تھوڑا سا پانی مانگتا ہے تو اس سے ایک عورت کہتی ہے، ''یہاں نمبر سے پانی ملے گا''۔ بوڑھا قطار میں کھڑا ہو جاتا ہے تب ہی ایک تیز گرم ہوا کے جھونکے سے وہ گر کر مر جاتا ہے۔ اس کے بعد کا منظر دیکھئے اور اس کے Ironical situation پر غور کیجئے: ''بوڑھے کو گرتے دیکھتے ہی ایک عورت نے جلدی سے ایک چلو پانی چھڑک دیا۔ دوسری نے اپنی پانی سے بھری دیگچی اس

کے ماتھے پر انڈیل دی۔ لیکن بوڑھا تو بے حس و حرکت پڑا تھا۔ اب اس کی تشنگی مٹ چکی تھی۔"

ہم زندگی میں چاہے کسی سے بداخلاقی اور بے حسی کے ساتھ پیش آتے ہوں لیکن مرنے کے بعد انسانی جبلتیں اپنا رخ موڑ لیتی ہیں۔ یہ کہانی ایک طنز ہے ہمارے خود ساختہ اخلاقی تصورات پر۔

اسی طرح 'مراجعت' پڑھتے ہوئے اندازہ ہوتا ہے کہ مفلسی اور غربت سے جب آدمی پریشان ہوتا ہے تو اس کے لئے اس کی لاڈلی بیٹی بھی بوجھ بن جاتی ہے۔ اس کے پس پردہ جہیز کی لعنت بھی کام کرتی ہے۔ اس کے کردار 'میں' کا اضطراب انسانی ذہن کو کچوکے لگاتا ہے۔ آخر کار یہ کردار جب اپنی بیٹی کا گلا دبا دیتا ہے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس جرم میں قاری بھی شریک ہو گیا ہے۔ یہاں ٹھہر کر ایک بات کہنا چاہتا ہوں کہ نیاز اختر صرف موتف (Motif) کو اہم تصور نہ کریں بلکہ اظہار کے اسلوب اور بیانیہ پر بھی توجہ دیں تا کہ کردار، افسانہ نگار اور قاری کے درمیان جو رشتہ ہو وہ اجنبیت اور استعجاب کا نہ ہو۔

شاعری ہو یا فکشن دونوں میں اپنی تہذیبی جڑوں کی تلاش کی جا سکتی ہے۔ نیاز اختر نے بھی اپنی کئی کہانیوں کے ذریعہ ان تہذیبی عناصر کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اپنی کہانی 'بوڑھے برگد کا انت' میں اس تہذیبی میراث کے تحفظ کی ایک دلدوز کہانی پیش کی ہے۔ جٹا شنکر نے برگد کی ایک ٹہنی پر بیٹھ کر انگریزوں سے جان بچائی تھی۔ تب سے وہ اس کی پوجا کرتا آیا تھا۔ لیکن جب اس جگہ اسکول کی نئی عمارت بنانے کی بات ہوئی اور سرکاری فنڈ سے یہ کام ہونے بھی لگا تو جٹا شنکر نے اسے بچانے کی بڑی کوششیں کیں۔ وہ ایک موقع پر کہتا ہے:

"یہ برگد کوئی معمولی برگد نہیں ہے، یہ میرے Sentiment سے جڑا ہوا ہے۔"

نیاز اختر نے جٹا شنکر کے اندرون میں جھانکنے کی کوشش کی ہے:

"ایک دفعہ جب زبردست طوفان کی وجہ سے برگد کی ایک موٹی ٹہنی ٹوٹ کر گر گئی تھی تو جٹا شنکر زار و قطار رو رہا تھا جیسے اس کا کوئی سگا اس سے ہمیشہ کے لئے بچھڑ گیا ہو۔"

سرکاری طور پر جب کوئی کام ہوتا ہے تو اسے گویا ہونا ہی ہوتا ہے۔ سرکاری افسروں اور ٹھیکے داروں کو کسی جٹا شنکر کے من میں پل رہی تہذیبی قدروں یا اخلاقی عوامل سے کوئی مطلب نہیں ہوتا۔ تبھی تو جٹا شنکر کی تمام تر کوششوں کے باوجود برگد کے پیڑ کو کاٹ گرانے کا حتمی مرحلہ بھی آجاتا ہے۔ لیکن جٹا شنکر بھی اپنی پیرانہ سالی کے باوجود اپنی جان دے دیتا ہے:

''دوسرے دن کہرے بھری صبح میں گاؤں کے لوگ جگے تو ایک عجیب دل سوز منظر ان کے سامنے تھا۔ بوڑھے برگد کے درخت سے بوڑھے جٹا شنکر کی لاش لٹک رہی تھی اور اس کی پتیوں سے برفانی رات کی شبنم کی بوندیں اس طرح ٹپک رہی تھیں جیسے جٹا شنکر کی موت پر نوحہ خوانی کر رہی ہوں۔''

برگد کی شاخیں اور جڑیں بھی جٹاؤں کی طرح ہوتی ہیں۔ برگد خود بھی قدیم تہذیب کی علامت ہے۔ جٹا اور برگد میں ایک طرح کا تہذیبی انسلاک بھی ہے۔

نیاز اختر کے کچھ افسانے جو میں نے پڑھے ہیں، ان میں 'افعی'، 'تپتی زندگی'، 'مراجعت'، 'رفو میاں' اور 'بوڑھے برگد کا انت' اہمیت کی حامل ہیں۔ ان کے یہاں ایک طرح کی دردمندی اور انسانی نفسیات سے قرب کا پتا چلتا ہے۔ ان کی نظر آس پاس کی اشیاء پر ہوتی ہے اور ان اشیاء، کائنات اور آس پاس کی زندگی کے مابین رشتوں کا وہ گہرا شعور بھی رکھتے ہیں۔ امید کی جاتی ہے کہ وہ اپنی کہانیوں کو مزید صیقل کرتے رہیں گے اور بالخصوص بیانیے کی مستحکم صورتحال پر توجہ دیں گے۔ میں ان کے افسانوی مجموعے پر دل کی گہرائیوں سے مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

☆☆☆☆☆
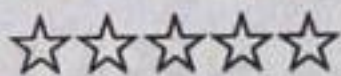
نیاز اختر کے افسانے : ایک جائزہ

منظر کلیم

کسی بھی ادبی تفہیم کے لیے روایت، تہذیبی عوامل کے ساتھ ساتھ عصری تقاضوں پہ نظر ضروری ہے۔ اردو زبان کا یہ کثیر سرمایہ ہمارے تصورات، اخلاقیات، تعلیمات، رجحانات، معاشرتی رویئے، مذہبی حسیّت کی بنیاد پر کھڑا ہے۔ وقت وحالات کے تئیں ان رویوں اور جذبوں میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ اس عمل میں اکثر ہم تعمیری تجربوں سے گزرتے ہیں، جو ادب کی صحت مند ارتقاء کا لازمی حصّہ ہے۔ فکشن سے لے کر شعریات تک سب پر اس تبدیلی کے اثرات موجود ہیں۔ پریس کی آزادی نیز برقی میڈیا نے اپنا زبردست رول ادا کیا ہے۔ وہ قصّے جو غیر یقینی سے لگتے تھے یا ان تک ہماری رسائی بروقت نہیں ہو پاتی تھی، اس صحافتی انقلاب نے ہنرمندوں کے ہاتھ ایسا برش تھما دیا جس کی مدد سے انھوں نے اپنے تخلیقی کینوس پر زندگی کے مختلف شیڈس کا جادوئی تماشہ دکھایا۔ اپنی صناعی، تراش اور مہارت سے ایسی تصویر اُبھاری جو بہ ظاہر ہماری نظروں سے اوجھل ہوتی ہیں۔ خصوصاً اگر انسانوں کے توسط سے بات کی جائے تو ادھر پچھلے ۲۰ برسوں سے یہ تبدیلی نمایاں طور پر محسوس کی جاسکتی ہے۔ کئی اہم افسانہ نگاروں نے اسلوب کی سطح پر اور موضوع کی بنیاد پر نئے اور کامیاب تجربے کئے۔ کسی نے ان دونوں سے ہٹ کر کردار کو اہمیت دی۔ معاملہ کچھ بھی ہو یہ تبدیلی یقیناً خوش گوار اور افسانے کے لئے نیک شگون مانی جاسکتی ہے۔

نیاز اختر کا شمار بھی ایسے ہی تخلیق کاروں میں ہوتا ہے۔ جن کا افسانوی سفر ۱۹۸۵ء کے آس پاس شروع ہوتا ہے اور ہنوز جاری ہے۔ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ''بوڑھے برگد کا انت'' میرے سامنے ہے۔ میں اس پریشانی سے واقف ہوں کہ کسی بھی افسانہ نگار کے لئے انتخاب کا عمل بہت دشوار کن ہے۔ یقیناً نیاز اختر کے سامنے بھی یہ دِقّت رہی ہوگی۔ اپنی تخلیق کو رد کرنا، اسے شامل نہ کرنا آسان نہیں ہوتا۔ لیکن نیاز نے بہت سنبھل کر اس انتخاب میں ایسے افسانوں کو شامل کیا ہے جو ان کی فکر کو سمجھنے میں معاون اور ان کی پہچان کو قائم کرنے میں مددگار ثابت ہو سکتے ہیں۔

یہ سوال انتہائی اہم ہے کہ تخلیق کا مقصد کیا ہے؟ اس کے جواب کئی ہو سکتے ہیں۔ جواب پر اختلاف بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن جس بات پر اتفاق ممکن ہے وہ یہ کہ تخلیق کا مقصد محض تفریح نہیں ہو سکتا۔ تخلیق جذبات، احساسات، نظریات کے بہاؤ کی وہ جامد شکل ہوتی ہے جو تخلیق کار کے وجود میں پنپتا اور اچھال مارتا ہے۔ اسے ایک طرح کی بے چینی سے دوچار کرتا ہے۔ اس پر بے چینی جب کوئی صورت اختیار کر لیتی ہے تو اسے سکون ملتا ہے۔ یہ کسی طرح بھی تفریحی نہیں کہلا سکتا۔ یہ بصری پیکر سے صوری پیکر کا ایسا سفر ہے جسے افسانہ زمین فراہم کرتا ہے۔

افسانہ میں قصے کی جامعیت، کردار کی انفرادیت اور حالات کی تصویر سے جو صورت ابھرتی ہے وہ فنکار کی شناخت کا سبب بنتی ہے۔ نیاز اختر نے اس بات کا خیال رکھا کہ صرف افسانہ کسی واقعہ کا بیان نہ رہ جائے بلکہ اس کے کردار اپنی پوری انفرادیت اور اثر انگیزی کے ساتھ دکھائی دیں جو بظاہر ہماری نظروں سے اوجھل ہوتے ہیں لیکن وہ ہمارے ساتھ ساتھ ہوتے ہیں۔ اور ان کی موجودگی کا احساس ہمیں اس وقت ہوتا ہے جب نیاز اس جانب اشارہ کرتے ہیں یا پھر ان کی دنیا میں کھینچ لاتے ہیں۔ یہی نیاز اختر کی کامیابی ہے۔

اُدق اور بوجھل زبان سے نیاز کو کوئی علاقہ نہیں۔ نہ افسانوں میں کوئی فلسفہ ہے اور نہ تبلیغی پہلو۔ البتہ ان کی کہانیوں میں زندگی اپنی تمام خوبیوں، خامیوں، خوبصورتی اور بدصورتی

کے ساتھ موجود ہوتی ہے اور یہی حقیقت ہے۔ان کے افسانوی کردار اپنی تمام کج روی اور انسانیت کے ساتھ موجود دکھائی دیتے ہیں۔ سیدھے سادے، سپاٹ لہجے میں قصہ بیان کرنا نیاز کی پہچان ہے۔

ایک اہم بات جو نیاز کے یہاں نظر آتی ہے وہ ہے ان کے افسانوں کا ماحول۔ نیاز کا زیادہ تر وقت جمشید پور جیسے صنعتی شہر میں گزرا۔ صنعتی شہر کی زندگی دوسرے شہروں کی زندگی کے مقابلے میں ذرا مختلف ہوتی ہیں۔ صنعتی شہر میں زندگی کا دائرہ محدود، لوگوں کی فکر محدود ہوا کرتی ہے، جو لوگوں کے حوصلوں کو بھی متاثر کرتی ہے۔ایک CIRCLE طے ہوتا ہے۔ جہاں زندگی گھومتے گھومتے اسی جگہ لوٹ آتی ہے جہاں سے اس نے سفر شروع کیا ہوتا ہے۔ نیاز کے افسانوں میں ایسے کردار جا بجا مل جائیں گے۔ نیاز کے افسانے کی قرأت سے فوری طور پر جو بات سامنے آتی ہے کہ نیاز نے قصّے سے زیادہ کردار کو اہمیت دی ہے۔ وہ افسانوں میں APPEAL کا خاص دھیان رکھتے ہیں۔

اس مجموعے میں ۲۶/افسانے شامل ہیں۔جن میں چند افسانے اہم اور قابلِ توجّہ ہیں، جو موضوع کے اعتبار سے بھی منفرد ہیں اور اس کے کردار بھی ہمیں اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ موضوع کا انتخاب یقیناً اہم ہوتا ہے۔لیکن اگر اس میں موجود کردار کی فنکارانہ تصویر نہ پیش کی جائے تو کتنا ہی اہم موضوع کیوں نہ ہو بے جان ہو کر رہ جاتا ہے۔ نیاز نے ان مسائل کو اپنے افسانوں میں جگہ دی ہے جو نہ صرف انفرادی سطح پر متاثر کرتے ہیں بلکہ پوری نسل اس سے متاثر نظر آتی ہے ۔ ماحولیات PRODUCTIVITY اور RE-PRODUCTIVITY مشینی زندگی کے اثرات، سیاسی شعبدہ بازی میں شامل سرکاری افسران، کرپشن، سرکاری محکموں کی ابتری، مذہب کی آڑ میں چھل، دقیانوسیت وغیرہ موضوعات نئے نہیں ہیں۔لیکن ان مسائل کو کردار کی عیاری، مکاری، مجبوری اور بے بسی کے حوالے سے دیکھنے کی کامیاب کوشش نیاز اختر نے کی ہے۔

GLOBLIZATION اور ENVIRONMENT کے منفی اثرات کو اگر جوڑ کر دیکھیں تو

اس تناظر میں ''گدھ'' ایک لاجواب کہانی ہے۔ نیاز کی اس کہانی میں عبرت ناک انجام کے ساتھ ساتھ ایک پیغام بھی موجود ہے۔ سائنسی ترقّی وترویج نے جہاں ہمیں ڈھیر ساری نعمتیں مہیا کرائی ہیں، وہیں اس کے مضر اثرات بھی موجود ہیں۔ منوچہر اور رستم جیسے کرداروں کے حوالے سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ ''گدھ'' خود ایک کردار کی صورت میں موجود ہے۔ دونوں نے مل کر ایک اہم سوال کھڑا کر دیا ہے۔

قدرتی نظام میں خلل، روزمرہ کی زندگی میں مشینوں پر انحصار، نئی سرمایہ کاری، صنعتی پھیلاؤ کی بدولت عنقا ہوتے ہوئے پرندے یہ سب آج کا بہت اہم مسئلہ بنتے جارہے ہیں۔ ایک معدوم ہوتی قوم اپنی روایت، رسم و رواج اور دستور کی بقاء کی ہارتی ہوئی جنگ لڑ رہی ہے۔ افسانہ ''گدھ'' اسی المیے کو پیش کرتا ہے۔ نیاز کی اس کہانی سے گزرتے ہوئے ہم ایسی اصطلاحوں، رسم ورواج کے علم سے گزرتے ہیں جس کی جانکاری ہمیں کم کم ہے۔ کرداروں کی تشویش، فکرمندی کو نیاز نے بہت ہی فنکارانہ ڈھنگ سے پیش کیا ہے۔

ایسی ہی ایک کہانی ''ٹرمنیٹر'' ہے جس میں افسانہ نگار نے سائنسی ترقی کی کریہہ صورت دکھائی ہے۔ بڑھتی آبادی اور ان کے مسائل پر قابو پانے کی خاطر سائنسی تجربات اہم رول ادا کرتے ہیں۔ یہ مسئلہ پوری دنیا کا ہے۔ کاشت کے روائتی نظام کی جگہ سائنسی تجربے نے لے لی۔ جو ترقی یافتہ ممالک کے حق میں مضر ثابت ہوا۔ کاروباری نقطۂ نظر سے ترقی یافتہ ممالک نے منافع کمایا اور ترقی پذیر ممالک کے کاشتکاروں کو مقروض اور مجبور بنایا۔ پیداواری نظام سے Recycling کا تصور ہی ختم ہو گیا۔ ایسے بیج بازار میں آئے جن کا استعمال صرف ایک بار ہی ممکن ہے۔ معلومات کی عدم موجودگی کسانوں کے حق میں لعنت ثابت ہوئی۔ پیداوار کی نظر سے دوبارہ ناقابل استعمال بیج نے نسلوں تک استعمال ہونے والے بیج کی دنیا ہی اجاڑ دی۔ نتیجتہً کسان قرض دار ہوتا گیا۔ حتّٰی کہ خودکشی پر مجبور ہو گیا ہے خصوصاً ایشیائی ممالک کی صورت حال پر نظر ڈالیں تو یہ آئے دن کی خبر بن چکی ہے۔ نیاز نے بھونسلے اور کلکرنی کے حوالے سے دونوں پہلوؤں کی جانب کامیاب اشارے کیے ہیں۔ دونوں کردار

کی الگ الگ ذہنی اور فکری عمل سے ٹرمنیٹر جیسی کامیاب کہانی وجود میں آئی۔

ٹائٹل کہانی ''بوڑھے برگد کا انت'' تاریخ، سیاست، قربانی، محبت اصولوں کی دیوانگی کی بہترین ملی جلی تصویر پیش کرتی ہے۔ اس قصے کا اہم کردار پجاری جٹا شنکر جو ۸۰ ربرس کا ہے، ایک ناقابل یقین کردار کی صورت میں موجود ہے۔

جٹا شنکر صرف شخص ہی نہیں بلکہ ملکی آزادی کی علامت بھی ہے۔ جس کی پوری زندگی جدوجہد سے عبارت ہے۔ برگد کے پیڑ سے اس کی جذباتی وابستگی ہے۔ برگد جو رونما ہونے والے کئی حادثوں، تحریکوں، تبدیلیوں کا شاہد ہے۔ اور جس کے کاٹے جانے کی منصوبہ بند کوشش کی خبر جٹا شنکر کو ملتی ہے تو ۸۰ ربرس کا بوڑھا بے چین ہو جاتا ہے۔ وہ بے بس ہے کچھ کر نہیں سکتا۔ لیکن اپنی کوشش جاری رکھتا ہے۔ افسوس کہ جب اسے یہ پتہ چلتا ہے کہ خود اس کے بیٹے بہو بھی اس برگد کے کاٹے جانے پر راضی ہیں تو یہ صدمہ ناقابلِ برداشت ہوتا ہے اور جٹا شنکر پیڑ کو بچانے کی آخری کوشش کے بہانے اس پر لٹک کر اپنی جان دے دیتا ہے۔ جٹا شنکر کی قربانی کیا رنگ لاتی ہے یہ کہنا مشکل ہے لیکن اس کردار نے آنے والی نسل کو ایک پیغام ضرور دے ڈالا۔ نیاز نے جٹا شنکر کے حوالے سے کئی اہم سوال اس افسانے میں ابھارے ہیں۔

رُتھی، ایک مجبور، بے بس، غریب مریض کی داستان ہے جس کا تصوّر ہی لرزا دینے والا ہے۔ یہ کسی ایک مریض کی کہانی نہیں بلکہ ہزاروں، لاکھوں مریض کی داستان ہے جو روز ایسے حادثات کا شکار ہوتے ہیں۔ کرپشن جس کا علاج کہیں نظر نہیں آتا، ہماری زندگی کا حصّہ بن چکا ہے۔ پالیسی کے مطابق سرکاری اسپتالوں کا انتظام ہر خاص و عام کے لئے ہے لیکن اس کا نظام دلالوں، DRUG مافیاؤں، ڈاکٹروں اور SO CALLED سماجی کارکن کے ہاتھوں میں ہے۔ یہ کاروباران سب کے مشترکہ تعاون سے بڑی تیزی سے پھل پھول رہا ہے۔ غریب مریض ان کے چنگل سے بچ نہیں سکتا۔ آپ ان کی مدد کے بغیر کچھ حاصل نہیں کر سکتے ہیں۔ نیاز کی یہ کہانی بالکل حقیقی اور مشاہدے پر مبنی ہے۔ آپ یہ صورت

حال کسی بھی نرسنگ ہوم یا سرکاری اسپتال میں دیکھ سکتے ہیں۔اس کہانی کا انجام چونکانے والا اور سبق آموز ہے۔

نیاز اختر نے ذاتی، سماجی اور اقتصادی مسائل کے ساتھ ساتھ ملکی اور عالمی مسئلے کو بھی اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔

Pollution آج علاقائی مسئلہ نہ ہو کر عالمی مسئلہ بن چکا ہے۔اس جانب پیش رفت بھی ہو رہی ہے۔ ماحولیات کی آلودگی کی فکر گمبھیر ہوتی جا رہی ہے۔آلودگی میں پانی کی آلودگی بھی ہے جس سے لاکھوں جانیں متاثر ہو رہی ہیں۔ صنعتی پھیلاؤ نے اسے مزید آلودہ بنا دیا ہے۔ندیاں جو کاشت کی روح سمجھی جاتی ہیں آبی وسائل کا سب سے بڑا ذریعہ ہیں، آلودگی کے سبب ناقابل یقین حد تک زہریلی ہو چکی ہیں۔گنگا ندی سب سے زیادہ متاثر ہوتی ہے۔حکومت کی عدم توجہی، غلط منصوبہ بندی اور سیاسی گرگوں کی سازشوں کی وجہ سے یہ مسئلہ مزید گہرا ہو گیا اور کوئی حل نظر نہیں آتا۔اس سمت اگر کوئی سنجیدہ کوشش ہوتی بھی ہے تو اسے سیاسی ہتھکنڈوں سے دبا دیا جاتا ہے۔ بلکہ کبھی کبھی تو ایمان دار لوگوں کو اپنی جان بھی کھونی پڑتی ہے۔ان حالات میں آلودگی سے نجات کی گارنٹی کہاں سے دی جاسکتی ہے۔نیاز اختر کی یہ فکرمندی پوری انسانیت کی فکرمندی ہے۔اس کا جواب ڈھونڈنا ہوگا۔افسانہ ''افعی'' میں نیاز نے اسی کی نشاندہی کی ہے۔

''گرہن'' نئے اور پرانے خیالات کے ٹکراؤ کی کہانی ہے۔ دقیانوسیت، جہالت کی پیداوار ہے۔اور جہالت کئی جرائم کو جنم دیتی ہے۔آج بھی گاؤں دیہات میں ایسے لوگوں کی کثیر آبادی ہے جو پریشانیوں اور امراض کا علاج جھاڑ پھونک میں کھوجتے ہیں۔ دوا سے زیادہ دعاء پر یقین رکھتے ہیں۔سجاتا بھی اسی جہالت کا شکار ہو گئی ہے۔سجاتا کے کردار میں ہم ایسے کئی کردار تلاش کر لیتے ہیں جو مثال کے طور پر ہمارے سامنے ہوتے ہیں۔گرہن کے زیرِ اثر لڑکی کا پیدا ہونا اور پھر سجاتا کے ساتھ ناروا سلوک اسے مزید گناہ پر اکساتا ہے۔یہ سماج کی ایسی گھناؤنی تصویر ہے جسے نکارنا مشکل ہے۔اس سے نجات کی صورت صرف اور صرف

علم سے ممکن ہے۔ جس کی برکتوں پر یقین فرسودہ روایت کے حامی کرتے نظر نہیں آتے۔

'نروان'، 'کُتا' اور 'تپتی زندگی' کے کرداروں کی نفسیات الگ الگ ہے۔ مذہب کی آڑ میں جنسی استحصال اور نجات کی صورت دراصل ان خواہشات کی عدم تکمیلیت ہے جسے مذہبی ضابطوں کے دائرے میں پیش کیا جاتا ہے۔ اور یہ امید کی جاتی ہے کہ انسان فطری تقاضوں کا منکر ہو جائے جو ممکن نہیں۔ دباؤ کے نتیجے میں وہ گناہ کی جانب قدم بڑھاتا ہے۔ اور مذہبی کجی کی مثال بن جاتا ہے۔ آئے دن ایسی خبریں ملتی ہیں کہ فلاں جگہ بھگوان کی مورتی ملی ہے پھر کیا ہے مذہبی تماشے شروع ہو جاتے ہیں۔ زائرین کا استحصال، مندر کی تعمیر اور اس کی آڑ میں نئے نئے کھیل شروع ہو جاتے ہیں۔ اور سب اپنے اپنے طریقے سے نروان ڈھونڈنے لگتے ہیں۔

'کُتا' جو وفاداری کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ امیر زادوں کی آسائش کا سامان بھی ہے۔ لیکن کبھی کبھی کُتے بھی کسی غیر متوقع حالات کے روبرو ہوتے ہیں تو وہ بھی اپنی ذمہ داری بھول کر تماشائی بن جاتے ہیں۔ دراصل یہ کہانی کُتے اور انسان کی نفسیات کو سمجھنے کی ایک کوشش ہے۔ اس کہانی کے انجام کو اگر دوسرا رخ دیا جاتا تو کہانی بہترین ہو سکتی تھی۔

پانی کی قلّت سے جڑی کہانی 'تپتی زندگی' دراصل ضرورت کی شدّت اور اس کی تقسیم کا قصہ ہے۔ پانی کی کمی دھیرے دھیرے علاقائی حدوں سے تجاوز کرتی جا رہی ہے۔ ماحولیات کی تبدیلی کے سبب بارش پر بھی اثر پڑ رہا ہے۔ ہم سب موجودہ وسائل کے تحفظ کی اہمیت کو نہ سمجھتے ہوئے اسے ضائع کرنے کے درپے ہیں۔ لہٰذا پریشانی کے شکار ہیں۔ لیکن جب بھی سہولت میسّر آتی ہے تو انسان اپنے مفاد کو ترجیح دیتا ہے اور یہ بھول جاتا ہے کہ یہ ضرورت اجتماعی ہے۔ خودغرضی انسانی سرشت کا حصّہ ہے۔ نیاز اختر کی کہانی انسانی جبلّت پر زبردست تازیانہ ہے۔

قصہ مختصر یہ کہ نیاز کے مشاہدے میں جو باتیں آتی گئیں، جو کردار ان کے سامنے آئے، معاشرتی، سیاسی، مذہبی و اخلاقی مسائل کی ترجمانی اس حوالے سے کرتے رہے۔ اپنی

ذمہ داری کو سمجھتے ہوئے ان فاسد مادّوں پر نشتر زنی کی جس سے انسانیت کو خطرہ لاحق ہے۔ کبھی صحافتی یا تبلیغی انداز حاوی ہونے نہیں دیا۔ ایک تدریجی پختگی کا احساس ان کے افسانوں میں دکھائی دیتا ہے۔ اس مجموعہ میں شامل دیگر کہانیاں بھی ہم سے توجہ چاہتی ہیں۔ ”بوڑھے برگد کا انت“ ان کے افسانوی سفر کا انت ہر گز نہیں ہو سکتا۔ یہ سفر جاری ہے اور بہتر سے بہتر کہانیوں کی توقع قاری ان سے رکھتا ہے، یہی ان کا مقصد بھی ہونا چاہیے۔
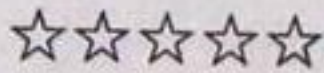
Email-manzarkalim1958@gmai.com

باتیں اپنی

نیاز اختر

چھٹپن سے ہی مجھے قصے کہانیاں سننے کی عادت رہی ہے۔ میں نرے گاؤں میں پیدا ہوا جہاں لوگوں کو جدید سہولیات میسر نہیں تھیں۔ مڈل تک تو گاؤں کے اسکول میں تعلیم پائی۔ ہائی اسکول کے لیے پگڈنڈیوں اور کھیتوں کی مینڈ کا سہارا لینا پڑا۔ برسات کے دنوں میں جگہ جگہ پانی کے جماؤ کو پار کر کے جانا پڑتا تھا۔ گویا کافی دقتوں کا سامنا کر کے ہائی اسکول تک کی پڑھائی کی۔ بھلا ہو مرحوم دادا جان اور پدر بزرگوار مرحوم کا جنھوں نے اپنی قلیل آمدنی کے باوجود میرا داخلہ ''آر۔ڈی۔اینڈ۔ڈی۔جے کالج، مونگیر میں کرانے کی ٹھان لی۔ جہاں میں نے انٹرمیڈیٹ سے لے کر ایم۔اے۔تک کی پڑھائی کی۔

تاریخی شہر مونگیر میں میرے قدم پڑتے ہی میرے اندر کا تخلیق کار سر ابھارنے لگا۔ میری رسائی جب اردو لائبریری بیکاپور تک ہوئی تو گویا میرے ادبی ذوق کو پنکھ لگ گئے۔ اردو ادب کی بیشتر داستانوی ادب سے لے کر جدید ادب تک کا مطالعہ کرنے کا موقع ملا۔ اس وقت مونگیر شہر میں کئی ادبی انجمنیں فعال تھیں۔ ان میں انجمن ترقی پسند مصنفین اور اردو فورم خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ بعد ازاں رہبر لائبریری توپ خانہ بازار کے وجود میں آنے کے بعد وہاں بھی ادبی محفلیں ہونے لگیں۔

میں جہاں قیام پذیر تھا وہاں میری ملاقات ایک ایسی شخصیت سے ہوئی جو ادب سے

گہرا لگاؤ رکھتے تھے۔ میری مراد ثاقب شہزادہ سے ہے جو شاعری کرتے تھے اور خوشخط لکھتے تھے۔ ان کے پاس ملک گیر پیمانے پر شائع ہونے والے لگ بھگ سارے رسائل و جرائد آتے تھے جس کا سب سے بڑا فائدہ مجھے ہوا۔ میں افسانوی کونپل کی آبیاری کرتا رہا۔ ثاقب شہزادہ میری لکھی کہانیوں کو سگریٹ کی کش کے بیچ fair کر دیتے۔ اس درمیان میری ملاقات پروفیسر اقبال حسن آزاد سے ہوئی۔ اس وقت ان کے افسانے ملک گیر پیمانے پر شائع ہو رہے تھے۔ میں بھی اپنی کہانیاں لے کر ان کے پاس جانے لگا۔ وہ میری کہانیوں کے نوک پلک سنوارنے لگے۔ اب میرے حوصلے بلند ہونے لگے۔ اور اس طرح میری پہلی کہانی بعنوان ''روح کا سفر'' سہ ماہی سالہ ''صدف'' بھاگلپور، جنوری تا مارچ ۱۹۸۵ء کے شمارے میں شائع ہوئی۔ ڈاکیہ نے جب شمارہ ہاتھ میں دیا، کھول کر دیکھا تو خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا۔ اس کے بعد تو یکے بعد دیگرے مختلف پرچوں میں شائع ہونے لگا۔ مونگیر میں اس وقت کئی انجمنیں کام کر رہی تھیں۔ ان انجمنوں سے میں بھی دھیرے دھیرے جڑنے لگا۔ اس وقت میرے اندر کے افسانہ نگار کو پروفیسر اقبال حسن آزاد ، پروفیسر شبیر حسن، پروفیسر راشد احمد (راشد طراز) ثاقب شہزادہ جیسے کئی ادب نوازوں نے جلا بخشی، میری حوصلہ افزائی کی جن کا میں تہ دل سے شکر گزار ہوں۔ دوستوں میں منتشر عالم، ارشد حسن، محبوب عالم، شہنشاہ عالم، سجاد حسین (منیش) قابل ذکر ہیں، انکا بھی میں شکر گزار ہوں۔

ستمبر ۱۹۹۵ء میں ملازمت کے سلسلے میں، میں شہر آہن جمشید پور پہنچ گیا۔ اور اردو مترجم کے عہدے پر ایس.ڈی.او. آفس دھال بھوم، جمشید پور میں فائز ہوا۔ شروع شروع میں یہاں کی فضا مجھے راس نہیں آئی۔ کچھ دنوں تک میں گویا ادب سے کٹ کر جمود کا شکار ہو کر رہ گیا۔ لیکن ایک دن آزاد کتاب گھر ساکچی سے نکل رہا تھا تبھی میری ملاقات مشہور افسانہ نگار اختر آزاد اور منظر کلیم صاحب سے ہوئی۔ باتوں ہی باتوں میں ان لوگوں کو معلوم ہوا کی ادب کا کیڑا میرے اندر بھی موجود ہے۔ تو انھوں نے شہر کی کئی انجمنوں کی جانکاری فراہم کی اور ان سے جڑ کر ادب کی خدمت کرنے کو اکسایا۔ اسکے بعد تو یکے بعد دیگرے مختلف

ادب نوازوں اسلم بدر، احمد بدر، افسر کاظمی، انور امام ،ممتاز شارق، یحیی ابراہیم ،تنویر اختر رومانی، اسلم جمشید پوری مہتاب عالم پرویز، ڈاکٹر آفاق احمد سے میری ملاقات ہوئی۔ اسلم بدر صاحب اس وقت اپنی کتاب "ساغر جم۔ جام سفال" کے سلسلے میں جمشید پور کے ہر گلی کوچے سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر شاعر و ادیب کو نکال رہے تھے اور ان سے انٹرویو لے رہے تھے۔ انھوں نے مجھے بھی ڈھونڈ نکالا۔ ہندی ادب کے ششی کمار، شنکر، سی بھاسکر راؤ، جے نندن اور کمل جیسے ساہتیہ کاروں سے بھی ترقی پسند مصنفین کی بیٹھکوں میں ملاقاتیں ہونے لگیں۔ اس طرح میرے افسانوی بال و پر سنورنے لگے۔ اور اسی کا نتیجہ ہے کہ آج میرا یہ افسانوی مجموعہ آپکے ہاتھوں میں ہے۔ اس کی اشاعت میں میری شریک حیات عصمت آرا کا ہر گام پر ساتھ رہا ہے۔

افسانوں پر آپ لوگوں کی گراں قدر رائے اور تاثرات کا شدت سے انتظار رہے گا۔

☆☆☆☆☆

گِدھ

"پتا ہے وہ بازو والے پلاٹ پر کیا ہو رہا ہے؟" منوچہر نے ڈونگر واڑی کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے رستم سے پوچھا۔

"ہوں۔" رستم نے ایک بار نظر اٹھا کر اس بڑے پلاٹ کی طرف دیکھا جس کے چاروں طرف چہار دیواری بن رہی تھی۔

"اِدھر بھی ایک کارخانہ۔ اب اس ڈونگر واڑی کا کیا ہوگا۔ آہور مزدہ ہی جانیں۔" منوچہر بڑبڑایا۔ جب کبھی وہ دارو کی بوتل چڑھالیتا تو اس کے ذہن پر یہی مسئلہ سوار ہو جاتا اور گھنٹوں اسی میں الجھا رہتا۔

"اب کیا ہوا.....؟" عادل گجدھر نے آتے آتے اس کی بڑبڑاہٹ سن لی تھی۔ وہ یہاں کا انچارج تھا اور ابھی ابھی بنگلی اور باؤلی سمیت پوری ڈونگر واڑی کا چکر لگا کر آ رہا تھا۔

"کیا ہوگا۔ تم کو معلوم نہیں؟ اب تین طرف سے کارخانہ ہو گیا۔ پیچھے والے سے سفید دھواں نکلتا ہے۔ دائیں بازو والے سے کالا۔ اب اس بائیں بازو والے سے نیلا نکلے گا۔" منوچہر کی باتیں سن کر پہلے تو رستم اور عادل کے چہرے پر مسکراہٹ آئی پھر فوراً ہی غائب ہو گئی۔

"اپن کیا کرے گا۔ اپنا پنچایت کو بتایا۔ سب لوگ سے مل کر کتی بار بولا۔ پر نتو کسی کو چنتا اِچ نہیں۔ سب بڑے لوگ ہیں۔ سب دوست ہیں۔ ایک ہی تھالی میں کھاتے ہیں۔ میری اور تیری کون سنے گا۔ میرا کیا ہے۔ پچاس برس سے اس ڈونگر واڑی کی سیوا کر رہا ہوں۔ اب تو آہور مزدہ جس دن بلالے۔" عادل گجدھر کا کرب اس کی آنکھوں میں چھلک آیا تھا۔

''تجھے بھی تو اسی بگھی میں غسل اور کفن دیا جائے گا۔ تو بھی اسی باؤلی میں گدھوں کے سامنے رکھا جائے گا۔ کہاں سے آئیں گے گدھ؟ اس سال کتنے بچے ہیں معلوم ہے نہ؟'' منوچہر کا نشہ بتدریج چڑھ رہا تھا۔

''سب معلوم ہے۔ کیا سمے تھا جب دو تین گھنٹوں میں سب کام چٹ پٹ ہو جاتا تھا۔ بس ہڈیوں پر ایسڈ ڈالو اور ٹاور آف سائلنس کے گڈھے میں انجر پنجر ڈال دو۔ اب تو دو تین دن لگ جاتے ہیں۔ تم کو رائٹ والا زمانہ یاد ہے؟'' عادل منوچہر سے مخاطب تھا۔

''ہاں تب تو ایک لاش ہفتے بھر تک پڑی رہتی تھی۔ گدھوں کا پیٹ بھرا ہوا تھا۔ ادھر آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے تھے۔'' منوچہر کی آنکھوں کے آگے سارا منظر فلیش بیک کی طرح گھوم گیا۔

''اب ٹھیک ہے۔ ایک بلاسٹ ہوا اور پچاس لوگوں کے چیتھڑے اڑ گئے۔ اب تو کوّے ہی کافی ہیں، گدھوں کی ضرورت ہی نہیں۔'' رستم سے برداشت نہیں ہوا تو وہ بھی بول پڑا۔ وہ میٹرک پاس تھا۔ روزانہ دو تین گھنٹے اخبار پڑھتا تھا۔ اور عام طور پر خاموش رہتا تھا۔

دونوں میں سے کسی نے اس کی بات پر کچھ نہیں کہا۔ تھوڑی دیر بعد منوچہر ایسے بولنے لگا جیسے خود سے باتیں کر رہا ہو۔

''تب کی بات دوسری تھی۔ وہ تو ہفتے دس دن کی سمسیا تھی۔ گدھ پھر لوٹ آتے تھے۔ اب تو ان کے گھونسلے خالی پڑے ہیں۔ ٹھیک ہی تو ہے۔ وہ کوئی آدمی تھوڑے ہی ہیں کہ چاروں طرف سے چمنیاں زہریلے دھویں چھوڑتی رہیں اور وہ آرام سے بیٹھے رہیں۔ پکشی ہیں اُڑ گئے۔ کہیں اور بسیرا بنایا ہوگا۔ ایک ہم ہیں تنخواہ کے لالچ میں پڑے ہیں۔ دو چار ہفتے پر کوئی لاش آ گئی تو سو پچاس روپے مل گئے۔

''وہ بھی باٹلی میں چلے جاتے ہیں۔'' رستم نے چٹکی لی۔ کوئی کچھ نہ بولا۔ رستم نے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''ایک بات پوچھوں؟''

''پوچھ...''

''ہم پارسی اپنی لاش گاڑتے یا جلاتے کیوں نہیں؟''

''کیونکہ مرنے کے بعد بھی کسی کے کام آئیں۔'' جواب منوچہر نے دیا۔

''مسلمانوں کی لاش بھی تو دھرتی کے کیڑے مکوڑے کھاتے ہوں گے؟''

''چپ رہو..... ہمارے زرتشت کا یہی حکم ہے۔'' منوچہر کو غصہ آ رہا تھا۔

''پرنتو...''

''کیا کنتو پرنتو....؟ چپ رہو، گدھوں کا ہونا ضروری ہے...تم کچھ نہیں سمجھتے۔''

عادل گجدھر کو ایک ایک کر ساری باتیں یاد آ رہی تھیں۔ آٹھ دس سال پہلے گدھ اچانک غائب ہو گئے تھے۔ دو لاشیں ہفتے بھر پڑی رہیں۔ پارسی سماج کی ہنگامی میٹنگ ہوئی جس میں دو باتیں طے ہوئیں۔ پہلی یہ کہ باؤلی کے چاروں کونوں پر سولر لینس (Solar Lens) لگائے جائیں تا کہ وہ سورج کی گرمی کو لاش پر مرکوز کریں اور لاش جلدی Decompose ہو جائے۔ دوسری یہ کہ فارن سے اچھی نسل کے گدھ منگوائے جائیں اور انھیں باؤلی کے ارد گرد کے درختوں پر بسایا جائے۔ ایک ملٹی نیشنل کمپنی کو آرڈر دیا بلجیم سے سولر لینس آئے۔ فٹ کر دئے گئے۔ اس سے تھوڑا افائدہ تو ہوا لیکن نقصان یہ ہوا کہ اگر بھولا بھٹکا کوئی گدھ آ بھی جاتا تو لاش کے آس پاس سولر لینس کی وجہ سے اتنی تمازت ہوتی تھی کہ وہ فوراً بھاگ کھڑا ہوتا۔ بالآخر دوسری ترکیب ہی کام آئی۔ نہ صرف کئی بدیسی گدھ اور اس کے چوزے لائے گئے بلکہ ان کے ساتھ کئی ماہرین بھی آئے جنھوں نے درختوں پر ان کے لئے مصنوعی گھونسلے بنائے اور ان گدھوں کو کئی مہینوں میں وہاں رہنے کا عادی بنایا۔ تب سے حالات بہتر تھے۔ لیکن گزشتہ دو سال میں آس پاس تین چار فیکٹریاں کھڑی ہو گئیں۔ چمنیوں نے دھواں اگلنا شروع کیا اور گدھ ایک ایک کر کھسکنے لگے۔ عادل کو ہمیشہ ایسا محسوس ہوتا کہ جو پانچ چھ گدھ یہاں رہ گئے ہیں وہ بھی اب بوڑھے ہو گئے ہیں اور کہیں جانے لائق نہیں ہیں۔ اچانک ایک سوال عادل کے ذہن میں کوندا۔ یہ گدھ کہاں گئے ہوں گے۔ اپنے ملک لوٹ گئے ہوں گے یا یہیں کسی دوسری اچھی جگہ پر رہتے ہوں گے۔ پھر اسے خود پر ہنسی آ گئی۔ سوچا گدھوں کا بھی کوئی ملک ہوتا ہے۔ ان کے لئے تو ساری دنیا برابر ہے۔

شام کا دھندلکا پھیل رہا تھا۔ دور سے دیکھنے والے کو ایسا محسوس ہوتا کہ درختوں سے اڑ کر تین گدھ ڈونگرواڑی کی سیڑھیوں پر بیٹھ گئے ہیں۔

جاڑے کا موسم تھا۔ اس دن سویرے سے ہی چہل پہل تھی۔ تینوں کو خبر تھی کہ ایک لاش آنے والی ہے۔ رستم نے اخبار پڑھ کر بتایا کہ شہر کے مضافات میں پہاڑی پر جو پکنک اسپاٹ ہے وہاں حادثہ ہوا ہے۔ ایم بی اے کے آخری سال کے طلبہ امتحان سے پہلے گٹ ٹو گیدر (Get Together) کے لئے یہاں جمع ہوئے تھے۔ پارٹی چل رہی تھی۔ شراب تو تھی ہی۔ نشے کے انجکشن اور دوسرے ڈرگس بھی تھے۔ جوش میں ڈوز زیادہ ہوتا گیا۔ ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوششیں جاری تھیں۔ تھوڑی دیر میں زیادہ تر زمین پر بے سدھ پڑے تھے۔ دو نے کم چڑھائی تھی وہ کسی طرح شام کو موٹر سائیکل پر ہائی وے تک پہنچے اور سڑک پر ڈھیر ہو گئے۔ پولس انھیں اسپتال لے گئی۔ تو رفتہ رفتہ ساری باتیں معلوم ہوئیں۔ رات میں کئی گاڑیاں اور ایمبولنس وہاں پہنچیں۔ تب تک پانچ طلبہ دم توڑ چکے تھے۔ بقیہ کو اسپتال میں داخل کرا دیا گیا۔ ان میں سے ایک پارسی ہے وہ تو یہیں لایا جائے گا۔

تبھی سے اس کا انتظار ہو رہا تھا۔ لیکن پوسٹ مارٹم کے بعد لاش تیسرے پہر ہی آپائی۔ بنگلی کے غسالوں نے غسل وکفن کے بعد لاش اسٹریچر پر رکھی۔ یہاں سے منوچہر اور رستم کا کام شروع ہوا۔ وہ اسے باؤلی کی طرف لے گئے۔ لاش کو اسٹریچر سے اتار کر باؤلی کی جالی پر لٹا دیا۔ منوچہر سرہانے کھڑا ہوا اور رستم پائنتی کی طرف۔ منوچہر نے لاش کا سر اٹھایا۔ رستم نے کفن کھینچ لیا۔ جسم پر صرف ستر پوشی کے لئے رومال بھر کپڑا رہ گیا جو کستی سے کمر میں بندھا ہوا تھا۔ یہ کستی سات یا نو سال کی عمر میں اس کے جسم پر ڈالی گئی ہوگی نوجوت کی رسم کے موقع پر۔ رستم نے دل میں سوچا۔

منوچہر کی آنکھیں بھر آئیں۔ ایسا نوخیز نوجوان اس کے سامنے لاش کی شکل میں کبھی نہیں آیا تھا۔ زیادہ تر تو بوڑھے اور بوڑھیوں کو ہی نپٹاتا رہا تھا۔ اس نے جیب سے چھوٹی سی بوتل نکالی اور غٹاغٹ کئی گھونٹ حلق کے نیچے اتار دیے۔

''قسم زرتشت کی، رستم آج میں ہل گیا...! ایکدم جوان لاش.... ہیرو ما فک۔ یہ لوگ نشہ کاہے کو کرتا ہے۔'' بوتل جیب میں رکھتے ہوئے منوچہر بدبدایا۔

''تم بھی تو کرتے ہو...'' رستم کفن کو تہہ کرتے ہوئے پھسپھسایا۔

منوچہر نے اس کی طرف لال آنکھوں سے دیکھا اور بوتل درختوں کی طرف جھٹکے سے پھینک دی اور غصے میں سیڑھیاں اترتا چلا گیا۔ پیچھے پیچھے رستم بھی باؤلی کا دروازہ بند کرتا ہوا نیچے اتر گیا۔

صبح منوچہر کی آنکھ نو بجے کھلی۔ وہ سیدھا باؤلی میں پہنچا۔ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر گیا۔ دروازہ کھولا اور وہاں کا منظر دیکھ کر اس کے پیروں میں جان نہ رہی۔ اس کے ہاتھ سے دروازے کا پلّا چھوٹ گیا اور وہ وہیں پر ڈھے سا گیا۔ سامنے لاش تقریباً صحیح سلامت تھی۔ مگر چاروں طرف سے گدھ ایسے بے حس وحرکت پڑے تھے جیسے اس کا سوگ منا رہے ہوں۔

☆☆☆☆☆
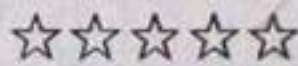
رنتھی

■ ماں کو پیٹک السر تھا۔ تقریباً ایک ماہ سے سلائن پر تھیں۔ گاؤں اور نزدیکی شہر کے لگ بھگ تمام نامی گرامی فزیشین اور سرجن دوائیاں دے کر تھک چکے تھے۔ علاج اور جانچ کے نام پر جتنا لوٹنا تھا انھوں نے لوٹ لیا۔ ہم لوگ اسی آس میں رہ گئے کہ دیر سویر فائدہ ہو ہی جائے گا۔ بالآخر شہر کے ڈاکٹروں نے ہاتھ اٹھا لیے اور ماں کو پٹنہ کے لیے ریفر کر دیا۔ جلدی جلدی میں اب دوستوں اور رشتہ داروں سے قرض لینے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

دوسرے دن تڑکے ہی ہم لوگ ماں کو لے کر پٹنہ کے لیے روانہ ہوئے۔ ڈاکٹر کے مطابق اندرا گاندھی آیوروگیان سنستھان کا رخ کیا۔ دشوار گزار راستوں اور جا بجا ٹریفک جام کی وجہ سے دوپہر میں وہاں پہنچے۔ کاؤنٹر کلرک نے بتایا کہ رجسٹریشن کا وقت ختم ہو گیا ہے۔ سنیچر کو بارہ بجے تک ہی مریض کا رجسٹریشن ہوتا ہے۔

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔ ماں کو کہاں لے کر جاؤں۔ تبھی ایک شخص جو حلیے سے ڈرائیور لگ رہا تھا، میرے قریب آیا اور ہمدردانہ لہجے میں بولا۔

''بھیا، ماتا جی کو کا ہوا ہے؟''

''پیٹ کی بیماری ہے۔ ایک مہینہ سے کوئی اناج گرہن نہیں کیا ہے۔ الٹی ہو جاتی ہے۔''

''ایک مہینہ!''

''ہاں۔''

''ہمری بات مانئے، ماتا جی کو نرسنگ ہوم میں بھرتی کرائیے۔ یہاں سرکاری اسپتال میں کوئی دیکھنے والا نہیں ہے۔ پاس ہی ایک اچھا کلینک ہے۔ چلنا ہے تو چلیے۔ خرچا تو ہو گا لیکن علاج

بڑھیا ہوگا۔" وہ اس طرح بول رہا تھا جیسے میں قارون کا خزانہ لے کر ماں کا علاج کرانے آیا ہوں۔ انھیں کیا معلوم کہ کتنی مشکل سے کچھ روپئے قرض لے کر آیا ہوں۔ لگاتار دو برسوں سے گاؤں سوکھے کی چپیٹ میں ہے۔ گاؤں کے نوجوان دلّی، پنجاب اور بنگال کے لئے نہیں نکلتے تو کتنوں کے گھر میں چولھا نہیں جلتا۔

یکے بعد دیگرے اور بھی کئی لوگ میرے قریب آئے اور بغیر مانگے کی صلاح دیتے رہے۔ ان کی ساری صلاحیں پرائیویٹ کلینک لے جانے کے لیے ہی تھیں۔ تبھی اسپتال کے ایک ڈاکٹر کا وہاں سے گزر ہوا جو شاید اپنی ڈیوٹی بجا کر جا رہا تھا۔ میرے پاس بھیڑ دیکھ کر رکا۔ ماں کی بیماری کے بارے میں دریافت کیا۔ اور سپاٹ لہجے میں کہا۔" ماتا جی کو P.M.C.H. لے جاؤ۔ وہاں کے ایمرجنسی وارڈ میں ایڈمٹ کراؤ۔ ان دلالوں کے چکّر میں مت پڑو۔ یہ سارے جونک ہیں جونک! جو سامنے والے کو چوس کر ہی دم لیتے ہیں۔"

ڈاکٹر کی صلاح اچھی لگی۔ میں فوراً ماں کو لے کر P.M.C.H. بھاگا۔ گاڑی ایمرجنسی وارڈ کے سامنے لگی۔ وارڈ کے باہر ہی اسٹریچر رکھے تھے۔ ماں کو گاڑی سے اتار کر اسٹریچر پر لٹا دیا۔ ایمرجنسی وارڈ کے گیٹ کے ٹھیک بغل میں کئی تیار شدہ رنتھیاں رکھی ہوئی تھیں۔ ماں کی نظر جب رنتھی پر پڑی تو ان کا کلیجہ منھ کو آنے لگا۔ اسٹریچر ڈھکیلتے ہوئے میں نے آگے بڑھ کر رنتھی والے سے پوچھا۔

"بھیا ایمرجنسی وارڈ کدھر ہے.... ماں جی کو بھرتی کرانا ہے۔"

"کہیں گاؤں سے آئے ہو کا بھیا۔ اندر ہو کے دائیں پھر بائیں۔ سامنے ایمرجنسی کے ڈاکٹر بیٹھتے ہیں۔" رنتھی بیچنے والا بتاتے بتاتے اپنی جگہ سے اٹھ کر میرے قریب آ گیا اور رازدارانہ لہجے میں بولا۔

"بھیا کونو پریشانی ہو تو کہیے گا۔ پورے راجیہ کا روگی آتا ہے یہاں۔ ہمری بات مانیے تو ایمرجنسی وارڈ میں امیت بابو ہیں اس کو پکڑ لیجیے، سب کام ہو جائے گا۔"

اتنا کہہ کر رنتھی والا بھی اسٹریچر کے پیچھے پیچھے ایمرجنسی وارڈ تک آ گیا۔ لپک کر وہ امیت

نام کے آدمی کو بلا لایا۔

''ای بیچارے اپنی ماں کو لے کر گاؤں سے آئے ہیں۔ آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔'' اس نے میری طرف سے کہا۔

''کا ہوا ہے ماتا جی کو.....؟'' امیت اسٹریچر کے قریب آ گیا۔

''ڈاکٹر نے تو السر بتایا ہے۔ کچھ کھا پی نہیں رہی ہیں۔ پانی بھی نہیں پچ رہا ہے۔'' میں نے ایک سانس میں ساری باتیں بتا دیں۔

''اچھا تو کچھ کرنا ہوگا۔'' اتنا کہہ کر اس نے اپنے کاندھے کو جنبش دی اور ماں کے اسٹریچر کو خود پکڑ کر ڈھکیلتے ہوئے آواز لگانے لگا۔'' بھیا جی.... بابو جی.... بہن جی،.... تنک ہٹئے.... سیریس میٹر ہے۔''

اس طرح امیت کئی اسٹریچر کو پیچھے چھوڑتے ہوئے ماں کو لے کر ڈاکٹر آچاریہ تک پہنچ گیا۔ ڈاکٹر آچاریہ نے ماں کے سارے پچھلے پرزے پڑھے۔ آلہ لگا کر جانچ کی اور فوراً سلائن لگا کر دوا شروع کرنے کو کہا۔ امیت نے ہی بیڈ کا انتظام کیا۔ ماں کو ایمرجنسی وارڈ کے بالکل اخیر میں بیڈ ملا جہاں سے مردہ گھر کی دیوار شروع ہوتی ہے۔ اس وقت امیت مجھے کسی فرشتے سے کم نہیں لگا۔

امیت نے ماں کو بیڈ پر لٹا دیا۔ وہ نرس کو بھی ترنت پکڑ کر لایا۔ اس درمیان امیت کے پیچھے پیچھے کئی لوگ چل رہے تھے۔ لیکن یہ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ وہ کیا چاہتے ہیں۔ اب امیت ڈاکٹر آچاریہ کے لکھے پرزے کو پڑھنے اور ہمیں سمجھانے میں لگ گیا۔

''ماں جی کی بیماری بہت بڑھ گئی ہے۔ ان کا خون اور پیشاب کا جانچ ہوگا۔ کچھ دوائیاں ہیں۔ چودھری میڈیکل سے لیجیے گا۔ مین گیٹ کے سامنے۔''

''امیت بابو تنی ہمرا بھی خیال رکھیے.....'' امیت کے ساتھ چلنے والے ایک شخص نے بیچ میں ٹہوکا لگایا۔ اس کی دیکھا دیکھی دوسرے نے بھی التجائی انداز میں دھیرے سے کچھ کہا۔ تب ماجرا سمجھ میں آیا کہ یہ چاروں بندے کسی نہ کسی Patho. Lab. سے جڑے ہیں۔ بلڈ اور پیشاب پاخانہ کے سیمپل لینے کے لیے پیچھے لگے ہیں۔

''ارے آپ لوگ سمجھتے کا ہے نہیں ہیں۔ای کیس تو ڈاکٹر آچاریہ جی کا ہے۔ای جانچ تو آپ جانتے ہی ہیں کس کو ملے گا۔''

اتنے میں ایک نوجوان نے سامنے سے آواز دی۔''امیت بابو ہم آ گئے ہیں۔آچاریہ جی سے بھینٹ بھی کرنا ہے۔کب فری ہوں گے ایمرجنسی وارڈ سے؟''

''ارے تم کو ہی تو کھوج رہے تھے۔کہاں بھاگا رہتا ہے۔دیکھو ای ماتا جی کا خون اور پیشاب دونوں کا جانچ ہے۔ٹھیک سے کرنا ہے۔بیچاری دیہات سے آئی ہے۔اور آچاریہ جی بولے ہیں کولر Symphony کا ہی لینا۔''

''ہسپتال میں جانچ کا انتظام نہیں ہے کا امیت بابو؟''میں اچانک پوچھ بیٹھا۔

''ارے یہاں جانچ کا کونو خاص انتظام نہیں ہے۔یہاں کے جانچ کو آچاریہ جی مانیں گے نہیں۔ارے آپ بے فکر رہیے۔تھوڑا پیسہ لگے گا مگر صحیح صحیح رپورٹ ماتا جی کے بیڈ پر پہنچ جائے گا۔سیمپل لینے دیجیے۔''

''دیکھ کا رہا ہے۔جلدی سے سیرنج نکال۔''امیت اس نووارد نوجوان سے یوں مخاطب تھا جیسے وہ اس کا ماتحت ہو۔

ایک اور شخص میڈیکل کٹ والا بیگ شانے پر لٹکائے ہوئے امیت کے پاس پہنچا اور اپنی جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے گویا ہوا۔''امیت بابو آپ کا پچھلا حساب ہو گیا ہے، لے لیجیے۔''

امیت بابو کے چلتے مجھے کافی سہولت ہوئی۔اس نے جاتے جاتے یہ بھی بتا دیا کہ کہاں پر سونا ہے اور کہاں کس ہوٹل میں کھانا کھانا ہے۔ڈاکٹر کے ترنت دیکھ لینے، بیڈ مل جانے اور علاج شروع ہو جانے کی وجہ سے ماں کو بھی تسلی ہوئی۔وہ بھی امیت بابو کے گن گانے لگی۔ورنہ بہت سارے مریض یہاں وہاں زمین پر پڑے تھے۔

کہتے ہیں اگر خدا کو دیکھنا ہو تو کسی اسپتال میں مریض کے بیڈ کے پاس کھڑے ہو جاؤ۔دن بھر کا تھکا ماندہ ہونے کے باوجود میں ایمرجنسی وارڈ کے بغل والے ہال میں پوری رات سو نہ سکا۔ہر پانچ دس منٹ پر کسی نہ کسی کے رونے، چلانے اور ماتم کرنے کی درد بھری آوازیں میری سماعت

سے ٹکراتی رہیں۔ کسی کا سہاگ لٹ گیا، کسی کا اکلوتا بیٹا مر گیا تو کسی کا بوڑھا باپ۔ ماحول بالکل سوگوار اور اذیت ناک لگ رہا تھا۔ رات آنکھوں میں ہی کٹ گئی۔

منھ اندھیرے اٹھا تو امیت بابو کو ایمرجنسی وارڈ میں موجود پایا۔ وہ ماں کے بیڈ کے پاس کھڑے ہو کر ان کی مزاج پرسی کر رہا تھا۔ اس کے ارد گرد اب بھی جانچ گھر والے خون اور پیشاب کا سیمپل لینے کے لئے منڈرا رہے تھے۔ میں داتون کر چکا تھا۔ رات بھر جگنے سے جسم ٹوٹ رہا تھا۔ چائے کی شدت سے طلب تھی۔ اس لیے امیت جی کو بھی چائے پینے کے لیے چلنے کو کہا۔

اب میں اور امیت جی اسپتال کے مین گیٹ کے بغل میں تھے، جہاں چائے، لٹی چوکھا اور جوس کی دکانیں تھیں۔ ایک چائے کی دکان پر پہنچتے ہی اس چائے والے نے کچھ روپے موڑ کر امیت بابو کو تھماتے ہوئے کہا۔ ''دھریے، ایکسیڈنٹ کیس والا وہی پہلوان جی نے دیا ہے۔ آپ کو پرنام بھی کہا ہے۔''

''بھلا آدمی تھا بیچارہ.... ڈاکٹر اپادھیائے کے علاج میں تھا۔ کھیت بیچ کر بیٹا کا پیر ٹھیک کر لیا۔'' اتنا کہتے ہوئے امیت نے ان مڑے تڑے نوٹوں کو اپنی جیب میں گھسیڑ لیا۔

تبھی ایک مدقوق سا شخص امیت کے پاس آ کھڑا ہوا اور گڑگڑاتے کے انداز میں کہنے لگا:

''ہمرا ا یکدم چھوڑیے دیے امیت بھیا۔ تنی ہمرو پر دھیان دیجیے گا۔''

اس شخص کی بات سن کر امیت آگ بگولا ہو گیا۔

''سالا اب تم سے کون بلڈ لے گا۔ پورے شریر میں تو الکوحل دوڑ رہا ہے۔ ایک کڈنی تو بیچے چکا ہے۔ اب کا دوسری کڈنی بھی بیچے گا۔ تم کو کتنا بار کہہ چکا ہوں کھینی بیچ، پان بیڑی بیچ۔ پونجی ہم کسی سے دلا دیں گے۔ دو ٹائم کا روٹی کا تو سہارا ہو جائے گا۔ لیکن تم مانتا کہاں ہے۔ خون بیچے گا۔ ایک بار میں ہزار روپے چاہیے۔ تھوڑا تھوڑا نہیں۔'' اتنا کہہ کر امیت بابو نے اپنی جیب سے دس کا ایک نوٹ نکالا اور اس شخص کو تھما دیا۔ اور چائے کا گلاس رکھتے ہوئے کہا۔

''چلیے بھیا۔ اس کا لمبا کہانی ہے۔ بھگوان آدمی کو غریب بنائے مگر بدھی ہین نہیں۔ تھوڑی عقل ضرور دے۔ کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ کتنو سدھاریے سدھرے گا نہیں۔ کتا کا دُمڑی

سالا۔ تین تین بار اسے چھوٹا موٹا بزنس کرنے کے لیے پیسہ دلوائے۔ لیکن ہر بار پونجی کو جوئے اور دارو میں اڑا دیا۔ کھانا ملے نہ ملے دارو ہونا چاہیے۔"

ماں کی طبیعت میں بتدریج سدھار ہو رہا تھا۔ اب انھیں ایمرجنسی وارڈ سے ٹاٹا وارڈ شفٹ کر دیا گیا تھا۔ میں اسٹو اور کچھ برتن ساتھ لایا تھا۔ روزانہ صبح شام دیگر لوگوں کی طرح وارڈ کے باہر پیپل کے درخت کے نیچے بنے شیڈ میں کھانا بنا کر کھانے لگا۔ ٹاٹا وارڈ میں شفٹ ہونے کے باوجود امیت بابو ماں سے ایک بار ملنے ضرور آتا۔ اور حال چال پوچھ کر چلا جاتا۔ میں کم از کم دو بار امیت بابو سے ضرور بھینٹ کرتا اور ان سے ماں کے متعلق صلاح لیتا۔

گرمی پورے شباب پر تھی۔ ایک امس بھری شام اچانک زوروں کا طوفان آیا اور خوب جم کر بارش ہوئی۔ بارش تھمی تو امیت بابو گھبرائے سے ماں کے پاس آئے اور آتے ہی مایوس کن لہجے میں بولے، "ماتا جی میرے لیے دعا کیجیے گا۔"

"ارے میں تو ساری دنیا کے لیے دعا کرتی ہوں، تمھارے لیے کیوں نہیں۔ تم نے تو میری جان بچائی ہے۔ ہر قدم پر مدد کیا ہے۔"

"ماتا جی! میرے بیٹے کو خطرناک بیماری ہو گئی ہے۔ سیریبلم ملیریا۔ دعا کیجیے کہ ہمرا بیٹا اچھا ہو جائے۔"

"ضرور اچھا ہو جائے گا۔" ماں نے ڈھارس بندھائی۔

ان دنوں ڈینگو اور ملیریا کے بہت سارے کیس اسپتال میں آ رہے تھے۔ امیت کے بچے کو سیریبلم ملیریا ٹریس ہوئی۔ اسپتال کے لگ بھگ سارے اچھے ڈاکٹر آپس میں صلاح مشورہ کر کے دوائیاں دے رہے تھے۔ لیکن امیت کے بچے کے بلڈ میں موجود Platelates کا تناسب گھٹتا جا رہا تھا۔ بلڈ چڑھایا جاتا تو تھوڑا بڑھتا مگر دوسرے دن گھٹ جاتا۔ اس طرح امیت کا بیٹا موت اور زندگی کے بیچ جھول رہا تھا۔ روزانہ اس کے بلڈ کے سیمپل جانچ میں جاتے اور RBC کاؤنٹ ہوتا۔

ایک دن اچانک اس کے بچے کے پلیٹ لیٹس کافی کم ہو گیے۔ ڈاکٹر نے فوراً بلڈ کا انتظام

کرنے کو کہا۔ تبھی سامنے سے ایک Pathology والا آتا نظر آیا۔

''ارے بھائی جلدی سے دو بوتل 'اے نگیٹو' کا انتظام کردو۔''

وہ تیزی سے گیا اور خون لاکر امیت کے ہاتھ میں تھما دیا۔ پہلی بوتل چڑھائی گئی تو بچّے کو تھوڑی راحت ملی۔ اس کے جسم میں حرکت ہوئی۔ لیکن دوسری بوتل آدھی چڑھی بھی نہیں تھی کہ بچے کی بے چینی بڑھ گئی۔ جلدی سے .C.C.U لے جایا گیا۔ لیکن چند سکنڈ میں بچے نے دم توڑ دیا۔ شاید بلڈ گروپ میں گڑبڑی تھی۔ .C.C.U کے باہر امیت کی پتنی دہاڑیں مار کر رونے لگی۔ وہاں موجود بھی لوگوں کی آنکھیں نم ہوگئیں۔ امیت پر تو جیسے پہاڑ ہی ٹوٹ پڑا تھا۔ بیٹے کو بچانے کی اس کی ساری کوششیں ناکام ہوگئیں۔

تھوڑی دیر میں کئی رشتہ دار جمع ہوگئے۔ لاش اسپتال سے ہی گھاٹ تک لے جانے کی بات طے ہوئی۔ امیت اپنے رشتے داروں کے ساتھ ایمر جنسی گیٹ کے پاس کھڑا تھا۔ ایک رنتھی والا دکاندار امیت کے قریب آیا اور ہاتھ جوڑ کر بولا۔

''بھیا، گھر لے کر جائیں گے یا سیدھے بانس گھاٹ؟''

''گھاٹ!'' امیت نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

''ای والا رنتھی وہاں رکھ آتے ہیں۔'' اس نے ایک رنتھی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''کتنے کا ہے؟''

''آپ سے پیسہ لیں گے؟.... کاہے شرمندہ کرتے ہیں۔ آپ کا بچہ ہمرا بچہ۔ آپ ہی لوگ سے تو ہمرا روجی روٹی چلتا ہے۔''

''پیسہ نہیں لے گا؟ سالا پیسہ نہیں لے گا۔'' یہ کہتے ہوئے امیت نے اس کا کالر پکڑ کے بے تحاشہ مارنا شروع کردیا۔

کئی لوگ بیچ بچاؤ کرنے دوڑے۔ میں نے بھی دونوں کو الگ کرنے کی کوشش کی۔ الگ ہوتے ہی دونوں نے پھر ایک دوسرے کو پکڑ لیا اور گلے لگ کر زور زور سے رونے لگے۔

☆☆☆☆☆

اپرینٹس

■ عبدالستار مضمحل قدموں سے گھر کے اندر داخل ہوا اور اپنی سائیکل سیڑھی کے نیچے لگا دی۔ اس کے ہینڈل سے سودا سلف سے بھرا تھیلا اتار کر ایک طرف رکھ دیا اور سامنے دالان میں بچھی آہنی چارپائی پر دراز ہو گیا۔ مئی مہینے کی چلچلاتی دھوپ میں وہ بازار سے گھر تک آنے میں نڈھال ہو گیا تھا۔ چارپائی پر لیٹتے ہی سیلنگ فین سے نکلنے والی گرم ہوا اسے اچھی لگنے لگی۔ اور پسینے سے شرابور عبدالستار چند منٹوں میں ہی غنودگی کے عالم میں محو خواب ہو گیا۔

ادھر عبدالستار کی بیوی ظہر کی نماز سے فارغ ہوئی اور جائے نماز سمیٹتے ہوئے اس کی نظر سودا سلف سے بھرے تھیلے پر پڑی اور پھر سامان ملانے اور سامان کو صحیح جگہ پر رکھنے کے لیے وہ سامان سے بھرے تھیلے لے کر بیٹھ گئی۔ تھیلے سے سامان نکالتے نکالتے اچانک ایک سامان کو دیکھ کر اس کا بلڈ پریشر بڑھ گیا اور یک بہ یک وہ چلا اٹھی۔

''رضیہ تیرے ابو سٹھیا گئے ہیں۔ تین دنوں سے لگاتار سپاری لانے کو کہتی آرہی ہوں تو کبھی زردہ لے آتے ہیں تو کبھی کتھا۔''

بیوی کی کرخت آواز سن کر عبدالستار کی آنکھیں کھل گئیں۔ وہ ہڑبڑا کر چارپائی پر اٹھ بیٹھا اور بجھی ہوئی آواز میں بولا۔

''ہاں رضیہ کی اماں تم ٹھیک کہتی ہو۔ واقعی میں سٹھیا گیا ہوں۔ جب سے کمپنی جانا بند ہوا ہے کسی بھی کام میں من نہیں لگتا ہے۔ جو بھی کہہ لو.....'' کہتے کہتے عبدالستار کی آنکھیں بھر آئیں اور کچھ جملے حلق میں ہی اٹک کر رہ گئے۔ شوہر کے اس ردعمل پر اس کی بیوی ایک دم سے خاموش ہو گئی۔

عبدالستار اس شہر کی سب سے بڑی فیکٹری میں کام کرتا تھا جہاں آہنی پتھر کو گلا کر لوہا اور اسٹیل بنائے جاتے ہیں۔ وہ اس فیکٹری کے Coak Oven ڈپارٹمنٹ میں کام کرتا تھا لیکن کمپنی کے Computerisation کیئے جانے اور Global Village بنتی جا رہی دنیا میں ملٹی نیشنل کمپنی سے مقابلہ کرنے کے لئے کمپنی نے ایک نئی اسکیم ای.ایس.ایس. یعنی (Early Separation Scheme) نکالی۔ جس کے تحت کمپنی کے بہت سارے ڈپارٹمنٹ میں مزدوروں کو Surplus ثابت کر کے انہیں طے شدہ یکمشت رقم دے کر ساتھ ہی ریٹائرمنٹ تک Basic اور D.A کو جوڑ کر ہر ماہ دینے کا معاہدہ کر کے سبکدوش کر دیا۔ اس اسکیم کے تحت کچھ لوگوں نے تو خوشی خوشی ای.ایس.ایس. لے لیا لیکن کچھ مزدور ایسے بھی تھے جنہیں یہ اسکیم قطعی پسند نہیں تھی لیکن مجبوری کے تحت انہیں ریٹائرمنٹ لینا پڑا۔ انہیں میں سے عبدالستار بھی ایک تھا۔ ای.ایس.ایس. کے تحت ہر ماہ طے شدہ تنخواہ اس مزدور کے بینک اکاؤنٹ میں آجاتی تھی۔ لیکن ان مزدوروں کو Increment, Bonus اور پروڈکشن پر ملنے والے گفٹ سے ہاتھ دھونا پڑا۔

عبدالستار کو ای.ایس.ایس. ملے تقریباً دو سال ہو چکے تھے لیکن ان دو برسوں میں اسے کافی تلخ تجربات سے گزرنا پڑا۔ اول تو اسے شہر کے عین وسط میں بنے ورکرز فلیٹ کو خالی کرنا پڑا۔ یکمشت اچھی رقم ملنے کی وجہ سے اس نے ان روپئے سے شہر سے کچھ دوری پر واقع غریب کالونی میں ایک نیم تعمیر شدہ مکان خرید لیا اور اسے رہنے لائق بنا کر وہیں شفٹ کر گیا۔ عبدالستار کا کنبہ آٹھ افراد پر مشتمل ہے۔ تین جوان بیٹیاں، دو جوان بیٹے، خود، بیوی اور اس کی بوڑھی ماں جسے وہ ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتا ہے۔ اس کو بیٹیوں کی شادیات کی بھی فکر لاحق تھی۔ ادھر دونوں جوان بیٹوں کو Gulf جانے کی دھن سوار تھی۔ دونوں بیٹوں نے تین تین مہینے کی Water Treatment کی ٹریننگ لے رکھی تھی۔ اور Travell Agent کے ذریعہ Gulf جانے کی ضد مچا دی۔ آخر کار عبدالستار کو دونوں بیٹوں کو اجازت دینی پڑی۔ اس کے دونوں بیٹے ممبئی چلے گئے۔ وہاں اس نے ایک Travell Agent سے بات کر لی۔ ایجنٹ نے فی آدمی ایک ایک لاکھ روپئے کا ڈیمانڈ کیا۔ سعودیہ جانے کی دھن میں دونوں بچوں نے فوراً اپنے والد سے بات کی اور مطلوبہ رقم کا ڈرافٹ ممبئی

منگوا کر ٹریول ایجنٹ کو رقم تھما دی۔ عبدالستار نے بھی سوچا چلو دونوں بچوں کی بے روزگاری دور ہو جائے گی اور سال دو سال میں اچھی خاصی رقم بھی گھر آجائے گی۔ لیکن معاملہ الٹا پڑ گیا۔ Travell Agent فرضی نکلا۔ بہت سارے بے روزگاروں کے روپے لے کر وہ چمپت ہو گیا۔ عبدالستار کو جب یہ خبر ملی تو اس نے اپنا سر پیٹ لیا۔

عبدالستار کو یوں ہی بے کام بیٹھے بیٹھے شب و روز گزارنا کھل رہا تھا۔ اب بھی اپنے ساتھیوں کو نیلی شرٹ اور بلیو پینٹ میں ملبوس، پاؤں میں سیفٹی بوٹ اور سر پر سیفٹی ہیلمٹ لگائے کمپنی میں جاتے دیکھ اسے بڑا عجیب سا لگتا تھا۔ اس کا بھی دل کرتا تھا کہ وہ بھی پہلے کی طرح اس ڈریس میں کمپنی کے اندر جائے اور اپنے ساتھیوں کے بیچ اپنے ہاتھوں کے ہنر دکھائے۔ لیکن ای.ایس.ایس. ملنے کے بعد تو وہ شاید ہی کبھی کمپنی کے اندر اپنے ڈیپارٹمنٹ میں داخل ہوا ہوگا۔ کھونٹی پر ٹنگا ہیلمٹ اور چوتال کے نیچے رکھے بھاری بھرکم موٹی کھال والے جوتے اب بھی اس کا منہ چڑھاتے نظر آرہے تھے۔ دو برس کے اندر عبدالستار کو ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کے شریانوں میں رواں دواں خون دھیرے دھیرے منجمد ہو رہا ہے اور وہ ذہنی طور پر مفلوج ہوتا جا رہا ہے۔ پھر کسی دوست نے اسے رائے دی کہ کیوں نہیں گھر پر ہی ایک چھوٹی سی پرچون کی دکان کھول لے۔ چار پیسے بھی آئیں گے اور طبیعت بھی لگتی رہے گی۔ عبدالستار نے ویسا ہی کیا۔ ایک چھوٹی سی پرچون کی دکان کھول کر بیٹھ گیا۔ لیکن کہتے ہیں کہ جب کسی انسان کا ستارہ گردش میں رہتا ہے تو سونا چھونے سے بھی مٹی بن جاتا ہے۔ سو عبدالستار کے ساتھ بھی وہی ہوا۔ کچھ روز تو دکانداری اچھی چلی لیکن دکان کی بیشتر پونجی ادھار کی نذر ہو گئی اور دکان کھوکھلی ہو گئی۔

ایک دن عبدالستار اپنے خیالوں میں غلطاں و پیچاں مسیحا ہوٹل میں چائے پی رہا تھا تبھی ایک آدمی اس کے سامنے آکھڑا ہوا اور یوں گویا ہوا جیسے برسوں بعد اس سے ملاقات ہوئی ہو۔

''چچا آپ بہت پریشان دِکھ رہے ہیں۔''

''ہاں بیٹے کیا بتاؤں۔ ای.ایس.ایس. ملنے کے بعد بہت ساری پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔'' عبدالستار نووارد کو ایک ہی نظر میں پہچان لیا۔ یہ وہی شیرو یعنی شیر محمد تھا جو گاؤں سے

ایک ہی کپڑے میں شہر چلا آیا تھا۔ اسے عبدالستار کے یہاں ہی پناہ ملی تھی۔ عبدالستار نے ہی اس کو سیفٹی ٹریننگ دلوائی تھی اور کمپنی کے اندر جانے کے لئے گیٹ پاس بھی بنوا دیا تھا۔ عبدالستار کے توسط سے اسے ایم۔ این۔ دستور جیسے بڑے ٹھیکیدار کے یہاں منشی کی نوکری مل گئی تھی۔ لیکن شیر محمد محنت اور لگن سے زندگی کی دوڑ میں بہت آگے نکل گیا تھا۔ اب وہ کمپنی کے اندر خود کی ٹھیکیداری کرنے لگا تھا۔

وہ دوبارہ عبدالستار سے مخاطب ہوا۔

''چچا ابھی کیا کر رہے ہیں۔''

''بس یوں ہی بیٹھے بیٹھے زندگی گزار رہے ہیں۔؟''

''میرے یہاں ایک اسٹور کیپر کی جگہ خالی ہے۔ چاہیں تو کل سے آجایئے۔ آپ تو میرے مسیحا ہیں۔ جو تنخواہ میں دوسرے کو دیتا تھا وہ آپ......''

عبدالستار نے فوراً حامی بھر دی۔ اسے تو ایسا لگ رہا تھا کہ اس کی ریگستانی زندگی میں نخلستان اُگ آئے ہوں۔ وہ اچانک کھل اٹھا۔ تیز قدموں سے وہ اپنے گھر کی طرف لپکا۔ گھر پہنچتے ہی اس نے کھونٹی سے لٹکے ہیلمٹ کو اتارا جس پر دھول کی موٹی تہہ جمی ہوئی تھی۔ اسے صاف کرنے کے بعد چوتال کے نیچے سے جوتے نکالے اور اسے جھاڑ پونچھ کر چھت پر دھوپ میں ڈال دیا۔ جوتے سوکھنے کے بعد اس نے جوتے پر پالش کر کے اسے اتنا چمکایا جیسے کسی سپاہی نے پریڈ کے لیے جوتے چمکائے ہوں۔

دوسرے دن عبدالستار وقت مقررہ پر ڈیوٹی جانے لگا اور شیرو کے اسٹور کے ہر کام کو بخوبی انجام دینے لگا۔ حسب معمول روزانہ کمپنی کے اندر جانا اور گھر آنا اسے بہت اچھا لگنے لگا۔ شب و روز خوشی خوشی گزرنے لگے۔ شیر محمد بھی اس کے کام سے مطمئن تھا۔

ایک دن شیر محمد اسٹور آیا اور بہت سارے کام عبدالستار کو سمجھا کر ایک ہفتہ کے لیے کسی ضروری کام کی غرض سے شہر سے باہر چلا گیا۔ اس بیچ عبدالستار کو کمپنی کے ایک ڈپارٹمنٹ میں کچھ سامان بھیجنے تھے لیکن وہ بات اس کے ذہن سے سرے سے نکل گئی۔ سامان یوں ہی اسٹور میں رکھا رہ گیا۔ کمپنی کے اعلیٰ افسر شیر محمد پر خفا ہو گئے اور اس کے اس ٹھیکے کو مسترد کر دیا۔

ٹھیکہ رد ہونے کی بات شیر محمد کو راستے ہی میں کسی دوست نے بتادی تھی۔ وہ شہر پہنچتے ہی سیدھے اپنے اسٹور پہنچا۔ وہ غصے میں آگ ہو رہا تھا۔ آتے ہی وہ عبدالستار پر برس پڑا۔

''چچا یہ آپ نے کیا کیا۔؟''

''بیٹا ذہن سے بات اتر گئی تھی........'' عبدالستار اپنی غلطی پر نادم تھا۔

''کمپنی نے آپ جیسے لوگوں کو ای.ایس.ایس. دے کر کمپنی کے حق میں اچھا کام کیا ہے۔ آپ جیسے لوگ تو دو کوڑی کے کام کے لائق نہیں ہیں۔'' اتنا کہہ کر شیر محمد اپنے پاؤں پٹکتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

عبدالستار کو یوں لگا کہ کسی نے اسے آسمان کی بلندیوں سے سیدھے سطح زمین پر گرا دیا ہو۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ کمپنی کے اندر Apprenticeship کر رہا ہو اور Instructor اسے ڈانٹ کر کوئی نکتے کی بات بتا رہا ہو۔

عبدالستار خاموشی سے اسٹور سے نکلا۔ اپنا ٹفن باکس سائیکل کے کیریئر میں لٹکایا اور گھر کی راہ لی۔ راستے میں مانگو پل پر اس نے سائیکل روک کر اپنے ہیلمٹ اور جوتے اتارے اور جھٹکے سے اسے سورن ریکھا ندی میں ڈال دیا۔

☆☆☆☆☆
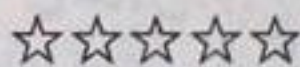
ٹرمنیٹر

■ بھونسلے اپنی بیوی کا ہاتھ پکڑ کر لہراتے ہوئے انداز میں بولا۔"اس بار میں تجھے کنگن ضرور لا کر دوں گا۔"

بیوی نے ہاتھ کھینچتے ہوئے کہا۔"پہلے سے خیالی پلاؤ مت پکاؤ۔ سے بڑا بے رحم ہوتا ہے۔"

لیکن بھونسلے خوشی سے پھولے نہ سما رہا تھا۔ اس بار اس نے کلکرنی سے ٹکر لے لی تھی۔ بھونسلے ایک غریب کسان تھا، لیکن کلکرنی کے لہلہاتے، سرسبز کھیتوں کو دیکھ کر اس کے سینے پر سانپ لوٹ جاتا تھا۔

کلکرنی بچپن سے ہی بڑا ذہین اور روشن خیال تھا۔ اس نے Botany سے گریجویشن کیا تھا۔ وہ ہر نئی زرعی ایجاد اور جانکاری سے متعلق مضامین بغور پڑھتا تھا اور ان چیزوں کے بارے میں جاننے کے لیے ہمیشہ کوشاں رہتا تھا۔ چاہے وہ بیج، کھاد ہوں یا پھر کھیتی باری کے اوزار۔ اتنا ہی نہیں وہ اس سلسلے میں قومی اور بین الاقوامی پالیسیوں پر بھی نگاہ رکھتا تھا۔

کلکرنی کے والدین اسے آفیسر کے روپ میں دیکھنا چاہتے تھے لیکن کلکرنی کے دل و دماغ میں بچپن سے ہی کھیتی باری رچی بسی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ پُرکھوں سے چلی آ رہی زراعت کے پرانے طریقہ کار کو تج کر جدید طریقے سے کھیتی کی جائے جس میں پیداوار بھی کافی ہو اور اس سے گاؤں اور ملک کا فائدہ بھی ہو۔ لہٰذا وہ والدین کی خواہش کے برعکس گریجویشن کے بعد کھیتی کے کام میں لگ گیا۔ سب سے پہلے اس نے دور دراز کے کھیت کے پلاٹوں کو بیچ کر اپنے کھیتوں کی آبپاشی کے لئے پمپ سٹ لگوایا۔ پھر بینک سے Finance کروا کر ٹریکٹر اور ہارویسٹر خریدا۔ اس نے پرکھوں کی زمین کو سونا اگلنے والی زمین بنا ڈالا۔

قدرت نے وہاں خاص قسم کی مٹی عطا کی ہے۔ کپاس کی کھیتی اس خطے کے لئے ریڑھ کی ہڈی ہے۔ لیکن ادھر کئی سالوں سے کھیتی گڑبڑ ہونے پر کئی کسانوں نے خودکشی کرلی۔ لیکن کلکرنی کی سوجھ بوجھ اور ہر چیز کے صحیح استعمال سے اس کی کپاس کی کھیتی اس علاقے میں مثالی ہونے لگی۔ ہر سال اس کو کافی مقدار میں بنولے حاصل ہوتے اور اچھی روئی کی گانٹھیں حاصل ہوتیں۔ دھیرے دھیرے اس کی خوشحالی بڑھتی گئی۔

ایک دن کلکرنی کی نظر ایک اخبار کے اشتہار پر پڑی جس میں لکھا تھا کہ ایک ملٹی نیشنل کمپنی کا کپاس کا بیج مارکیٹ میں آ گیا ہے۔ بیج بھنڈار والے نے اس بیج کی مختلف خصوصیات بھی گنوائی تھی۔

کلکرنی نے اس کے بارے میں پہلے بھی پڑھ رکھا تھا۔ اشتہار دیکھ کر وہ فوراً شہر گیا اور اپنے کھیتوں کے لائق کپاس کا بیج خرید کر لے آیا۔ بیج کے ساتھ دی گئی ہدایات کو دھیان میں رکھتے ہوئے اس نے اپنے کھیتوں میں بیج بویا۔ اس بیج سے نکلے کپاس کے پودے کافی تندرست تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے کھیت میں پودے لہلہانے لگے اور پہلے سے بھی زیادہ مقدار میں بنولے حاصل ہوئے اور خوب گانٹھیں نکلیں۔

کلکرنی کے کھیتوں میں لہلہاتی فصلوں کو دیکھ کر آس پاس کے کسان للچائی ہوئی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ ان کا بھی ویسی ہی کھیتی کرنے کو جی چاہتا تھا۔ اس کی کھیتی سے سب سے زیادہ متاثر بھونسلے تھا۔ وہ ایک چھوٹا سا کسان تھا لیکن چاہتا تھا کہ کلکرنی کی طرح اپنے کھیتوں میں وہ بھی کپاس کی اچھی فصل اگائے۔ کلکرنی کے کھیتوں کی مینڈ پر بیٹھ کر وہ گھنٹوں اس کی فصل دیکھتا رہتا۔ اتنا ہی نہیں فصل جب کلکرنی کے کھلیان پہنچتی تو وہ کھلیان کے آس پاس بھی اکثر گھومتا رہتا اور حسرت و یاس بھری نگاہوں سے دیکھا کرتا تھا۔

اگلے برس بھونسلے نے اپنے قریبی بازار کے ایک ساہوکار سے کچھ روپئے ادھار لیے اور سب سے پہلے کرائے پر ٹریکٹر سے اپنے کھیتوں کی اچھی طرح جتائی کروائی۔ پاس کے ایک پمپ سٹ والے سے اپنے کھیتوں کی سینچائی کے لئے ادھار پانی بھی لیا۔ بازار سے اچھی کھاد بھی خرید کر لے آیا۔ ساری اشیاء مہیا ہونے کے بعد اس نے اپنے کھیتوں میں بیج بوئے۔

وہ یہ سوچ سوچ کر بڑا خوش ہو رہا تھا کہ اس بار کی کھیتی میں اتنا منافع ہوگا کہ وہ اپنے نئے پرانے سارے قرضے اتار دے گا۔ وہ خوشی سے پھولے نہ سمارہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کلکرنی کی طرح وہ بھی ایک بڑا کسان بن جائے گا اور گاؤں میں اس کی بھی قدر و منزلت بڑھ جائے گی۔

بھونسلے روزانہ اپنے کھیتوں تک جاتا اور بیج سے کونپل پھوٹنے کا انتظار کرتا رہا۔ اس طرح ہفتہ عشرہ اور پھر بیس پچیس دن گذر گئے لیکن اس کے کھیتوں میں ایک بھی بیج سے پھوٹ کر پودا باہر نہیں نکلا۔ جبکہ آس پاس کے سارے کھیتوں میں کپاس کے پودے اُگ آئے تھے۔ اب اسے تشویش ہونے لگی اور طرح طرح کے خیالات اس کے من میں اٹھنے لگے۔ ایک بات اس کے من میں ہمیشہ کچوکے لگاتی رہتی تھی۔ لیکن وہ کیا کرے یہ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ ہار کر ایک دن بھونسلے نڈھال سا ہولے ہولے قدموں سے کلکرنی کے گھر جا پہنچا اور سیدھے اس کے قدموں پر گر گیا۔

''دادا ہم کو معاف کردو۔''

''ارے بھائی بات کیا ہے؟ آپ بڑے بھائی ہو کر مجھے شرمندہ کیوں کررہے ہیں؟ کلکرنی نے بھونسلے کو بانہوں سے پکڑ کر اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔

''دادا میں نے آپ کے کھلیان سے کپاس کے بیج چرائے تھے اور اسے ہی کھیتوں میں بویا۔ لیکن اب تک ایک بھی پودا...'' اتنا کہتے کہتے وہ روہانسا ہوگیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔

''کیا...؟ کلکرنی چلایا۔

''ارے بھائی یہ آپ نے کیا کیا؟ وہ ٹرمنیٹر بیج تھے۔ اس کا استعمال تو کھیتوں میں صرف ایک بار ہی ہوسکتا ہے۔ یہ ہمارے پرانے بیج نہیں، ان بیجوں سے ایک ہی بار پودا نکلتا ہے۔''

اتنا سننا تھا کہ بھونسلے اپنا ماتھا پکڑ کر وہیں زمین پر بیٹھ گیا۔ اسے لگا بیج کی طرح اس کے وہ سارے سپنے بھی اندر ہی اندر گھٹ کر رہ گئے جن سے نئی کونپلیں نکلنے والی تھیں۔ اس کی آنسوؤں بھری آنکھوں کے آگے ان کسانوں کے چہرے جھلملانے لگے جنھوں نے خودکشی کرلی تھی اور ان کے بیچ سے جھانکتی ہوئی اس کی بیوی کی سونی کلائیاں!!

☆☆☆☆☆

بوڑھے برگد کا انت

گاؤں کا بوڑھا مگر چھتنار برگد سر نہورائے کھڑا تھا۔ اس کی کئی جٹائیں لٹکتی ہوئی زمین میں پیوست ہو چکی تھیں اور جڑ کی شکل اختیار کر چکی تھیں۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ جگدیش پور گاؤں کا یہ بوڑھا برگد دو صدی قبل سے اِستادہ ہے اور گاؤں میں رونما ہونے والے ہر چھوٹے بڑے حادثوں کا چشم دید گواہ ہے۔ اس نے زوال پذیر مغلیہ دورِ حکومت کو دیکھا تھا اور برطانوی سامراجیت کے دور بھی دیکھے تھے۔ گوری پلٹن کے جبر و استبداد بھی دیکھے تھے۔ پھر آزاد ہندوستان کی صبح نو کے لہراتے پرچم بھی دیکھے تھے۔ لیکن اچانک بوڑھا برگد ایک نئی سمسّیا کی زد میں آ گیا۔

برگد سے متصل ایک پرائمری اسکول تھا جو کبھی مکتب ہوا کرتا تھا۔ اسکول کی آدھی چھت پر برگد کی چھوٹی بڑی ٹہنیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ برگد کی ایک طرف گول پختہ چبوترا بنا تھا جس پر بیٹھ کر نہ جانے گاؤں کے کتنے مسئلوں کے حل نکالے گئے ہوں گے اور پنچ پرمیشور کے فیصلے سنائے گئے ہوں گے۔ ہندو مسلم ہر مذہب اور ذات کی ہزاروں براتیں اسی برگد کی چھاؤں میں اتاری گئی ہوں گی۔ اتنا ہی نہیں، دُلہن کی وداعی کے لیے مستعمل سواریاں چاہے بیل گاڑیاں ہوں، تانگے ہوں، رکشے ہوں یا پھر کاریں ہوں، اسی برگد کے نیچے لگا کرتی تھیں اور وہیں سے دلہن وداع ہوتی تھیں۔ اس کی ایک Logic یہ تھی کہ برگد کی چھاؤں تلے سے وداع ہونے والی دلہن ہمیشہ ہری بھری، ٹھنڈی اور آسودہ رہے گی۔ اسے زندگی میں کبھی پریشانیوں کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔

گاؤں کے اس بوڑھے برگد کا سب سے بڑا پجاری جٹا شنکر تھا جو اسّی کے لپیٹے میں تھا۔ لیکن اب بھی چاق و چوبند تھا۔ وہ روزانہ گاؤں سے ایک کیلومیٹر پر واقع ندی تٹ پر اشنان کرتا اور ایک لوٹا جل لیے ہری جاپ کرتا ہوا برگد کے قریب آتا اور لوٹے کا نرمل جل اس برگد کی جڑ میں اُنڈیل

دیتا۔ جٹا شنکر کو جل ڈالتے دیکھ کبھی لوگ پوچھ بیٹھتے کہ آخر وہ دیوی دیوتا پر جل ارپن نہ کر برگد کی جڑ میں ہی کیوں ڈالتا ہے تو جٹا شنکر بڑی ونمرتا سے جواب دیتا۔

''یہ برگد کوئی معمولی برگد نہیں ہے، یہ میرے Sentiment سے جڑا ہوا ہے۔''

اور پھر جٹا شنکر ماضی کے ان لمحوں میں گم ہو جاتا جب اس نے گاؤں کے فریڈم فائٹروں کے ساتھ انگریزوں سے لوہا لیا تھا۔ سن بیالیس کے ''انگریزو، بھارت چھوڑو'' آندولن میں جٹا شنکر نے بھی اہم رول ادا کیے تھے۔ حالانکہ اس آندولن کو انگریزوں نے سختی سے کچل دیا تھا۔ لیکن آج بھی انگریزوں کے بوٹوں کی کھٹ کھٹ اور ان کے گھوڑوں کی دل دہلانے والی ٹاپوں کی گونج جٹا شنکر کو پریشان کر دیتی ہیں اور اس کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ویسے ناگفتہ بہ حالات میں اسی برگد نے جٹا شنکر کی جان بچائی تھی۔ گوری پلٹن چپے چپے پر اس گاؤں کے آزادی کے سورماؤں کی تلاش کر رہی تھی تو جٹا شنکر اسی برگد کے پیڑ پر چڑھ گیا تھا اور ایک موٹی ٹہنی سے لپٹ کر پوری رات بتائی تھی۔ تب سے جٹا شنکر اس برگد کا پجاری بن گیا۔ یہ دیگر بات ہے کہ جٹا شنکر آزاد ہندوستان کا فریڈم فائٹر نہیں بن سکا۔

لیکن آج جٹا شنکر برگد کو لے کر وِکٹ سمسّیا سے نبرد آزما تھا۔ برگد سے متصل پرائمری اسکول کو مڈل اسکول میں تبدیل کر دیا گیا تھا اور ریاست کی نئی سرکار میں منتخب ایک ایم.ایل.اے. نے، جو اسی گاؤں کا رہنے والا تھا، اپنے فنڈ سے اسکول کی نئی بلڈنگ کے لئے دس لاکھ روپے Sanction کیے اور اس بلڈنگ کے لیے اسی زمین کا انتخاب کیا گیا جہاں پر بوڑھا برگد اِستادہ تھا۔

جٹا شنکر کو جب یہ سب معلوم ہوا تو اس کے تو ہوش اڑ گئے۔ اس کے پیروں تلے زمین کھسکتی ہوئی محسوس ہوئی۔ ایک دفعہ جب زبردست طوفان کی وجہ سے برگد کی ایک موٹی ٹہنی ٹوٹ کر گر گئی تھی تو جٹا شنکر زار و قطار رویا تھا جیسے اس کا کوئی سگا اس سے ہمیشہ کے لئے بچھڑ گیا ہو۔ لیکن آج تو پورے برگد کی جان پر بن آئی تھی۔ جٹا شنکر نے فوراً بلاک آفس جا کر اس اسکیم کا پتہ چلایا، ریکارڈ نمبر نوٹ کیا اور ایک عرضی سیدھے طور پر بلاک ڈیولپمنٹ آفیسر کو دی۔ ساتھ ہی اس کی کاپی سب ڈیویژنل آفیسر اور ضلع مجسٹریٹ کو دی۔ تینوں اعلیٰ افسران کے پاس خود سے جا کر اپنی مدعا بیان کی

اور مذکورہ اسکیم کی جگہ بدلنے کی مِنّت کی لیکن سبھی افسران نے سرد مہری سے کام لیا۔ سبھوں نے یہی عذر پیش کیا کہ یہ اسکیم خود منتری مہودے نے پاس کی ہے۔ جگہ بدلی نہیں جاسکتی۔

سبھی افسران کو معلوم تھا کہ یہ منتری ان پانچ آزاد ایم.ایل.اے. میں سے ایک تھے جنھوں نے اسمبلی انتخاب میں آزاد امیدوار ہو کر اپنی جیت درج کرائی تھی اور ان ہی کے سہارے سرکار بنی تھی۔ پانچوں نے من چاہے پورٹ فولیو حاصل کیے تھے۔ بلکہ یوں کہا جائے کہ ان ہی کے ہاتھوں میں سرکار کی نکیل تھی۔

جٹا شنکر نے جب دیکھا کہ ضلع مجسٹریٹ سے لے کر مکھیا تک ان کی بات نہیں مان رہے ہیں اور ٹھیکیدار کام شروع کرنے پر تلا ہوا ہے تو انھوں نے سوچا کہ کیوں نہیں اس بات کو اسمبلی کے چل رہے سیشن میں اٹھوایا جائے۔ لہٰذا جٹا شنکر ریاست کے ایک اپوزیشن لیڈر کے بنگلے پر پہنچے۔ وہاں پہنچ کر انھوں نے لیڈر سے ملاقات کی۔ لیڈر نے ساری باتیں سن لیں اور پھر بولے۔ ''میرے پی .اے. کو نوٹ کرا دیں۔''

انٹر کام پر انھوں نے اپنے پی اے سے نہ جانے کیا بات کی۔ جٹا شنکر باہر برامدے میں بیٹھے پی.اے. صاحب کو ساری باتیں نوٹ کرا دی۔ لیکن پی.اے. نے آخر میں کہا۔

''معاملہ گمبھیر ہے، اسمبلی میں بات اٹھانے کے لئے کم سے کم ایک لاکھ تو آپ کو بطور نذرانہ پیش کرنا ہوگا۔ آخر ایک اہم وزیر کے خلاف جو اسمبلی میں سوال اٹھانے ہیں۔''

پی.اے. کی بات سن کر جٹا شنکر کے تو ہوش اڑ گئے۔ رشوت کی جڑیں اتنی گہری ہو چکی ہیں یہ اسے قطعی معلوم نہیں تھا۔ وہ مایوس ہو کر واپس لوٹ آیا۔

ادھر اسکیم کے ٹھیکیدار نے منتری جی سے شکایت کر رکھی تھی کہ گاؤں کا بوڑھا جٹا شنکر اسکول بلڈنگ بنانے میں بادھا ڈال رہا ہے۔ تب منتری جی خود ہی ایک دن گاؤں پہنچے اور پہنچتے ہی انھوں نے جٹا شنکر کے اکلوتے بیٹے وجے شنکر کو اپنے بیٹھک خانے میں بلوایا۔ وجے شنکر کے آتے ہی منتری جی تلخ لہجے میں بولے۔

''ارے وجیا، اپنے باپ کو کاہے نہیں سمجھاتا ہے۔ ایک معمولی برگد کو لے کر تیرا باپ اتنا بڑا

جھمیلا کھڑا کر دیا ہے۔"

"کیا کروں سر، ان کی تو متی ماری گئی ہے۔ کہتے ہیں برگد سے میرا sentimental لگاؤ ہے۔ برگد ہی میری زندگی ہے۔ برگد کی رکشا کرنا میرا دھرم ہے۔"

اتنا سننا تھا کہ منتری جی آگ بگولا ہو گئے اور اگالدان میں پان کی پیک پھینکتے ہوئے ٹھیکیدار کی طرف مخاطب ہوئے۔

"ارے سنو، تم ایک کام کرو۔ برگد کی کٹائی کے لئے فارسٹ ڈپارٹمنٹ سے N.O.C. حاصل کرلو اور پھر کام شروع کر دو۔ میں D.F.O. کو کہہ دوں گا۔ تمہیں جلد از جلد N.O.C. دے دیگا۔"

وجے شنکر جب اٹھ کر جانے لگا تو منتری جی نے دوبارہ تاکید کی کہ وہ اپنے باپ کو سمجھائے اور برگد کو کاٹنے دے۔ وجے شنکر تو یہ بات کہہ کر واپس لوٹ آیا کہ وہ اپنے باپ کو سمجھائے گا لیکن اس کی اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ اپنے پتا جی سے دوٹوک باتیں کر سکے۔ لہٰذا گھر آ کر اس نے اپنی بھڑاس اپنی پتنی کے سامنے نکال لی اور پتا جی کو سمجھانے کا ذمہ اپنی پتنی پر چھوڑ دیا۔

جاڑے کی برفانی رات تھی۔ رات کے ساڑھے آٹھ بج رہے تھے۔ جٹا شنکر دھیرے سے کھانستے ہوئے گھر کے اندر داخل ہوئے اور آتے ہی بہو سے کھانا نکالنے کو کہا۔ بہو تو ان کے انتظار میں تھی ہی۔ جلدی جلدی ایک موڑھا بچھا دیا اور کھانا لگا دیا۔ جٹا شنکر نے جیوں ہی پہلا نوالہ اٹھایا کہ اس کی بہو بول اٹھی۔

"باؤ جی، منتری کی بات کاہے نہیں مان لیتے ہیں۔ منتری اِن کو بُرا بھلا بول رہا تھا۔ باؤ جی ایک برگد کو لے کر اتنی سمسّیا کیوں.....؟"

اتنا سننا تھا کہ جٹا شنکر ہاتھ میں اٹھایا نوالہ دوبارہ برتن میں رکھ دیا۔ اور پھر بغیر کچھ کہے گھر سے نکل کر تھان کی طرف چل دئے۔ بہو بولنے کو تو بول گئی لیکن ان کے ردِعمل پر پریشان ہوگئی۔ سسر کو روکنے کی کوشش کی لیکن جٹا شنکر آگے بڑھ گئے۔ وہ اب تک گاؤں کی سمسّیا کو گھر نہیں لاتے تھے۔ لیکن آج برگد کی سمسّیا ان کے گھر میں در آئی تھی۔ بہو کی بات سن کر جٹا شنکر اندر ہی اندر ٹوٹنے

اور بکھرنے لگے۔

ٹھیکیدار کو تمام سرکاری افسران اور سیاسی لیڈروں سے Co-operation مل رہا تھا۔اس نے محکمہ جنگلات سے بھی ایک دن کے اندر No objection certificate حاصل کرلیا اور خوشی خوشی گاؤں میں اس بات کی منادی کرادی کہ کل سے برگد کی کٹائی کا کام شروع ہوگا۔اور پھر اسکول کی نئی بلڈنگ کا سنگِ بنیاد رکھا جائے گا۔

دوسرے دن کہرے بھری صبح میں گاؤں کے لوگ جگے تو ایک عجیب دل سوز منظر ان کے سامنے تھا۔بوڑھے برگد کی ڈال سے بوڑھے جٹاشنکر کی لاش لٹک رہی تھی اور اس کی چھتنار پتیوں سے برفانی رات کی شبنم کی بوندیں اس طرح ٹپک رہی تھیں جیسے جٹاشنکر کی موت پر نوحہ خوانی کر رہی ہوں۔

☆☆☆☆☆

حقیقت

■ میں گاندھی میدان کے ٹھیک پیچھے خان فلیٹ کی تیسری منزل پر رہتا ہوں۔ خان فلیٹ اور رانی اماں لاج کے عین وسط میں ایک بڑا سا خالی پلاٹ ہے جس میں بہت سے چھوٹے بڑے خود رو پیڑ پودے اگ آئے ہیں۔ میری بالکونی کا دروازہ اسی خالی پلاٹ کی طرف کھلتا ہے۔ اسی بالکونی میں بیٹھ کر اکثر میں اپنی کہانیوں کے تانے بانے بُنتا ہوں اور پھر اسے قرطاسِ ابیض پر قلم بند کرتا ہوں۔

ایک دن جیوں ہی میں نے بالکونی کا دروازہ وا کیا تو ایک نہایت ہی سبک، دیدہ زیب اور خوش رنگ تتلی میرے کمرے میں در آئی۔ تتلی کے پر اتنے خوبصورت تھے کہ میری آنکھوں کو خیرہ کیے ہوئے تھے۔ تتلی کے پر کی زمین پیلے رنگ کی تھی اور اس پر جا بجا کالے بوٹے اور حاشیے پر لال رنگ کا بارڈر۔ غرض قدرت کی طرف سے تتلی کو عطا کی گئی رنگینی دل کو بھا رہی تھی۔ تتلی نے کمرے کے اندر داخل ہوتے ہی پہلے تو ایک پورا چکر کمرے کا لگایا۔ اس کے بعد سیدھے اس شوکیس کی طرف گئی جس میں رنگ برنگے مخملی اور سنتھیٹک پھولوں کے گلدستے رکھے تھے۔ تتلی ہمک ہمک کر گلدستے کے پاس لگے شیشے کے شٹر پر جاتی اور پھر اُڑ کر شوکیس کے اوپری سرے پر جا بیٹھتی۔ کبھی نائٹ بلب پر بیٹھتی تو کبھی روشن دان کے شیشے پر۔ اس طرح ایک گھنٹے تک تتلی میرے روم کا چکر لگاتی رہی۔ لیکن تتلی کی نگاہوں کا مرکز شوکیس میں رکھے ہوئے پھولوں کے گلدستے تھے۔ میں ٹکٹکی باندھے اس کی حرکات کا جائزہ لیتا رہا۔ ایک گھنٹے بعد تتلی اسی خالی پلاٹ کی طرف اُڑ گئی جہاں سے آئی تھی۔

دھیرے دھیرے صبح سویرے میرے کمرے کے اندر آنا اور پھر شوکیس کے چکر کاٹنا اور لوٹ جانا تتلی کا روز کا معمول بن گیا تھا۔ روز سویرے سویرے اسے دیکھ کر میرا دل باغ باغ ہو جاتا

تھا۔ اب تو اس تتلی کو دیکھ کر میری چار سالہ بچی مسکان تتلی کو پکڑنے کے لئے ہاتھ آگے بڑھاتی، تتلی اُڑ کر شوکیس کے اوپری سرے پر جا بیٹھتی۔ مسکان اسے پکڑ کر ہاتھ میں دینے کی بارہا ضد کرتی لیکن میں اسے سمجھا بجھا کر شانت کر دیتا۔

صبح صبح تتلی کا میرے کمرے میں آنا اور کمرے میں منڈلانا مجھے بہت اچھا لگتا تھا۔ ایک دن تتلی میرے کمرے میں داخل ہوئی اور معمول کے مطابق شوکیس کا چکر کاٹ رہی تھی۔ مجھے لگا تتلی کی حالت ان سامراج وادی ممالک کی طرح تھی جو کمزور اور چھوٹے ملکوں کے قدرتی ذخائر کے لئے ان کے ارد گرد چکر لگاتے پھرتے ہیں۔ تبھی میں نے اپنی بیوی روبینہ کو آواز دی۔

''ڈارلنگ، دیکھو نہ تتلی کمرے میں آگئی ہے۔ کتنی خوشنما ہے۔''

''ارے پر والی ہے یا پر کٹی؟'' روبینہ نے کچن سے ہی سیدھے مجھ پر وار کر دیا۔

''ارے بھاگیہ وان، پر والی تتلی ہے۔ عمر کے اس پڑاؤ پر کون احمق پر کٹی تتلی مجھ پر مہربان ہوگی؟'' میں نے صاف گوئی سے کام لیا۔

''تم مردوں کا کیا ٹھکانہ، عمر کے کسی پڑاؤ پر کبھی بھی تم مرد کچھ بھی کر سکتے ہو۔ مسٹر گل کو کیا ضرورت تھی دیول بجاج کی کمر پر ہاتھ رکھنے کی؟ اور پھر نٹراجن کو ہی لو، سارا ملک اور ساری دنیا اس کے بدنما کارنامے پر تھو تھو کر رہی ہے۔''

بیوی کی ان دو مثالوں کو سن کر میں لاجواب ہو گیا اور بس اس کے جملے کی کاٹ میں میں اتنا ہی کہہ سکا۔ ''سکّے کے دو پہلو ہوتے ہیں۔ صرف مردوں کو ہی موردِ الزام ٹھہرانا پوری مرد برادری کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔''

میری بیوی ایک بات کے لیے ہمیشہ محتاط رہتی ہے کہ میاں بیوی کے بیچ کسی تیسرے فرد کا عمل دخل نہ ہو۔ لہٰذا جب بھی وہ کسی پارٹی میں میرے ساتھ جاتی ہے تو اس کی پوری توجہ مجھ پر اور مجھ سے ملنے جلنے والوں پر ہوتی ہے۔ خاص کر جب کبھی آفس کی کوئی لیڈی اسٹاف میرے قریب آ کر ہنس ہنس کر باتیں کرتی تو وہ لپک کر میرے قریب آ جاتی ہے اور اشارے کنائے میں کچھ ایسی باتیں کہہ جاتی ہے کہ میری کولیگ برا سا منہ لیے اپنی راہ لے لیتی اور گھر آ کر میری بیوی منہ بنا بنا کر ان

لوگوں کے بارے میں گویا ہوتی۔ ''تمھاری وہ بال کٹی لیڈی اسٹاف مجھ کو ذرہ برابر نہیں بھاتی۔ تم اس سے دور ہی رہنا۔ اور مسز چکرورتی جس کے گال پر کالا تل ہے ایکدم ڈائن صفت ہے۔ نین نقش تو دیکھو، سلولیس بلاؤز پہن کر کولھے مٹکاتی پھرتی ہے۔''

اس طرح وہ پارٹی سے لوٹ کر پارٹی میں موجود لوگوں، خاص کر عورتوں کے بخیے ادھیڑتی رہتی اور میں ہوں، ہاں میں اس کی باتوں کا جواب دیتا رہتا۔

اس بیچ کچھ دنوں کے لیے میں شہر سے باہر گیا ہوا تھا۔ واپس لوٹ کر آیا اور صبح میں نے بالکونی کا دروازہ کھولا تو حسب معمول اس سبک اندام تتلی کا میرے کمرے میں گزر نہیں ہوا۔ مجھے کچھ عجیب سا لگا۔ فلیٹ سے لگے پیڑ پودے پر بھی نظر دوڑائی لیکن اس تتلی کا کہیں بھی نام ونشان نہیں تھا۔ تب میں نے بیگم کو آواز دی اور پوچھا۔

''وہ تتلی کہیں نظر نہیں آرہی ہے۔ میرے غائبانے میں وہ کمرے میں نہیں آتی تھی کیا؟''

''آتی تھی۔ لیکن ایک دن تتلی کے آتے ہی میں نے شوکیس کا شٹر ہٹا دیا اور تمھارے ان مصنوعی پھولوں کے گلدستے کی اور تمھاری حقیقت اسے بتا دی۔'' اتنا کہہ کر وہ اپنی ساڑی کا پلو کمر میں اُڑستی ہوئی کچن کی طرف چل دی۔

میرے ذہن میں بار بار ایک ہی سوال گونجتا رہا کہ اس نے میری حقیقت بتائی یا ایک معصوم تتلی کی خوشی چھین کر اپنی............؟

☆☆☆☆☆
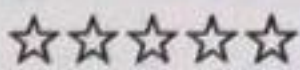
افعی

ماگھی پُرنماشی کا دن تھا۔ آج سیتا کنڈ میں بہت بڑا میلہ لگنے والا تھا۔ منھ اندھیرے ہی عورتوں، بچوں اور مردوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ گنگا اشنان کیلیئے کشٹ ہرنی گھاٹ کی اُور جانے لگے۔ اس علاقے کے لئے یہ میلہ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ سال میں تو ایک ہی بار یہاں ایسا زبردست میلہ لگتا ہے، جس میں مٹھائیاں اور کھلونے تو بکتے ہی ہیں ساتھ ہی لکڑیوں کے طرح طرح کے سامان بھی بکتے ہیں۔ پلنگ، چوکی، کرسی، ٹیبل، النا پالنا، اسی طرح جانے کتنے لکڑی کے سامان یہاں ہر سال بکتے ہیں اور قدرے سستے داموں میں۔ غرض ایک عجیب وغریب ہنگامہ آرائی رہتی ہے۔

لیکن یہ ایک عجیب سی بات ہوئی کہ اشنان گھاٹ سے سیتا کنڈ کے یاتری سیتا کنڈ کے احاطے میں جانے کے بجائے صدر ہسپتال کے میدان میں جمع ہونے لگے۔ سویرے سویرے ہی عجیب شور وغوغا ہونے لگا۔ لوگ پریشان ومضطرب تھے۔ بدن پہ سبھوں کے گیلے کپڑے جوں کے توں تھے اور لوگ اپنے اپنے بدن نوچے جارہے تھے۔ گوری اور پتلی چمڑی والے تو بالکل سرخ ہورہے تھے اور ان کی بے چینی دیکھی نہیں جارہی تھی۔

نزدیک کے بھی ڈاکٹروں کو فوری طور پر بلایا گیا اور ہسپتال کے سارے ملازم مریضوں کی دیکھ ریکھ میں مصروف کار ہو گئے۔ فوری جانچ اور علاج سے کچھ لوگوں کو سکون ملا، مگر زیادہ تر لوگ بے چین تھے۔ ترنت ہی یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح سارے شہر میں پھیل گئی۔ سارے ذمہ دار آفیسر ہسپتال کے احاطے میں سمٹ آئے۔

جس گھاٹ پر لوگ اشنان کئے تھے، وہاں کے پانی کی جانچ ہوئی تو معلوم ہوا کہ پانی میں کوئی زہریلا کیمیکل ملا ہوا ہے، جس کے جسم پر لگنے سے گوشت گل سکتا ہے۔ فوراً ہی شہر کی واٹر سپلائی بند کردی گئی اور اعلان کیا گیا کہ کوئی بھی آدمی گنگا اشنان نہ کرے۔

شہر کے ٹھیک شمال مغرب میں گنگا بہتی ہے اور اسی گنگا کے تٹ پر تین چار چھوٹی بڑی فیکٹریاں واقع ہیں۔ ان فیکٹریوں کی گندگی کا نکاس گنگا ہی میں ہے۔ گنگا ندی جوان گندگیوں کو اپنے آنچل میں سمیٹ کر اپنے نرمل جل میں ملا لیتی ہے۔

اب ایک معمہ تھا کہ آخران تمام فیکٹریوں میں سے زہریلا کیمیکل کس فیکٹری سے نکلا۔ کلکٹر صاحب نے جانچ پڑتال کے لئے ایک کمیٹی بنائی، جس مین کئی معتمد ڈاکٹر اور پولس آفیسر شامل تھے۔ سبھی فیکٹریوں میں چھان بین شروع ہوگئی۔

خبر ملتے ہی دوسرے دن ریاست کے وزیر صحت جائے وقوع پر آپہنچے۔ وزیر موصوف نے میدان اور بیڈ پر پڑے مریضوں کی مزاج پرسی کی۔

ہسپتال کے احاطے ہی میں وزیر موصوف کے بھاشن کے لئے ایک پلیٹ فارم بنایا گیا جس میں وزیر صحت کے علاوہ شہر کے بہت سے ذمہ دار آفیسروں نے بھی مختصر بھاشن دئے۔ صدر ہسپتال کی لیڈی سول سرجن مسز گنگاوتی سنہا نے بھی بھاشن دیا۔

''بھائیو! یہ ایک المیہ ہے جو صرف ہمارے شہر کا ہی نہیں بلکہ پورے ہندوستان کا المیہ ہے۔ ہندوستان کی زیادہ تر فیکٹریاں گنگا اور دوسری ندیوں کے کنارے پر واقع ہیں اور ان کی گندگیوں کا نکاس گنگا اور دوسری ندیوں میں ہوتا ہے۔ اسی گنگا میں لاکھوں لوگ نہاتے ہیں اور لاکھوں کو پانی بھی اسی سے پینا پڑتا ہے۔ اس طرح کے جو حادثات ہوتے ہیں، یہ صرف لاپرواہی کی وجہ سے ہی ہوتے ہیں۔ اس خطرناک کیمیکل ملے پانی کو زیادہ پی لینے کے بعد بچنا مشکل ہے اور بچ جائے تو اسے کوئی مہلک مرض ہو جائے گا۔ خیر میں آپ سب کو اور وزیر صحت موصوف کو یہ بتادوں کہ میں بہت جلد آپ لوگوں تک یہ خبر دے دوں گی کہ کیمیکل کس فیکٹری سے نکلا ہے۔ کل تک رپورٹ مل جائے گی۔'' اور اتنا کہہ کر مسز سنہا روہانسی اپنی سیٹ پر بیٹھ گئیں۔

عام جنتا نے مسز گنگاوتی کے بھاشن سے تو سکون کی سانس لی مگر فیکٹری کے مالکوں کی صف میں بے چینی پھیل گئی۔

دوسرے دن مسز گنگاوتی کی لاش اشنان گھاٹ کی نچلی سیڑھیوں پر ہچکولے کھا رہی تھی۔

☆☆☆☆☆

اپنی اپنی صلیب

امی اسکی بات سنتے ہی بگڑ اٹھیں۔

''تمھاری عقل چرنے تو نہیں گئی؟ اس کا باپ مڈل اسکول کا ماسٹر ہے۔ وہ بھلا کیا دے گا؟''

''لیکن امی.....''

''یہی نا کہ وہ تم سے پیار کرتی ہے۔ ارے آج کل کی لڑکیاں ہوتی ہی ایسی ہیں۔ پیار کے دو میٹھے بول بول کر اچھے بھلے لڑکوں کو پھانس لیتی ہیں اور پھر اس لڑکی میں کون سا سرخاب کا پر لگا ہے۔ اتنی بڑی دنیا ہے۔ لڑکیوں کا کال ہے کیا؟''

''لیکن امی میں کسی اور.....'' انور نے دوبارہ کچھ کہنا چاہا۔

''ارے تم سمجھتے کیوں نہیں۔ کیا تمھیں اسی لیے انجینئر بنایا ہے۔ تمہارے لیے تو میں ایسی لڑکی لاؤں گی کہ بس دیکھتے رہ جاؤ گے۔ تمہارے ابو کل حسین آباد جا رہے ہیں لڑکی دیکھنے۔ سنا ہے بہت بڑے لوگ ہیں۔ پشتینی دولت کے مالک ہیں۔ کئی بیگھے تو زمین ہے۔ شہر میں کئی مکانات ہیں۔ موٹر گاڑی، نوکر چاکر، حوالی موالی..... کسی چیز کی کمی نہیں۔'' وہ مسرت آمیز لہجے میں کہتی چلی گئیں۔ اتنے میں انور کے ابو نے آواز دی۔ امی ان کی آواز سن کر دوڑی چلی گئیں اور انور اپنے کمرے کے دروازے پر ساکت و جامد کھڑا سوچتا رہا۔

وہ عجیب کشمکش کا شکار ہو گیا تھا۔

وہ ایک ایسے چکرویوہ میں پھنس گیا تھا جس سے باہر نکلنا اس کے بس سے باہر تھا۔

ایک طرف اس کے سپنوں کی شہزادی تھی جسے وہ اپنی جان سے بھی زیادہ چاہتا تھا اور دوسری جانب اس کے والدین تھے جن کی دل شکنی کرنا وہ گناہِ عظیم سمجھتا تھا۔ والدین کی اجازت کے بغیر وہ کوئی کام نہ کرتا تھا اور چونکہ وہ ان کی اکلوتی اولاد تھا اس لیے وہ لوگ بھی اس پر اپنی جان

چھڑ کتے تھے۔

شام کا سرمئی اندھیرا فضا کو اپنی گرفت میں لینے کے لیے دھیرے دھیرے بڑھتا چلا آرہا تھا۔ انور اپنا البم دیکھنے میں منہمک تھا۔ ایک صفحہ پر آکر اس کی نگاہیں ٹھٹھک گئیں۔ اس نے البم کو سینے سے لگالیا اسی لمحے امّی کی آواز سنائی دی۔ امّی کی آواز سن کر اس نے جلدی سے البم کو اپنے سینے سے ہٹایا اور میز کی دراز میں رکھ دیا۔

''انور بیٹے! آج میں بہت خوش ہوں..... تمہاری منسوب طے پا گئی ہے۔ حسین آباد کے نعیم صاحب کی سب سے بڑی لڑکی ہے۔'' وہ خوش کن لہجے میں بتانے لگیں۔

''امّی! آخر آپ نے میری خواہش کو رد کر ہی دیا۔'' انور نے رندھے ہوئے گلے کے ساتھ کہا۔

''تم تو جانتے ہی ہو بیٹے کہ تمہارے ابّو ہر کام اپنی مرضی سے کرتے ہیں۔ میں کہتی تو وہ مان جاتے کیا؟ اور انہیں تو ذرا ذرا سی بات پر غصہ بھی آجاتا ہے۔ اب اگر کچھ کہوں گی تو ایک دم سے اُکھڑ جائیں گے۔ اور پھر اس میں حرج ہی کیا ہے۔ نعیم صاحب اتنا جہیز دیں گے کہ ہمارا گھر بھر جائے گا۔''

انور کو محسوس ہوا کہ وہ کسی بھاری بوجھ کے نیچے دبا جا رہا ہے۔ اس نے کہنا چاہا کہ اسے جہیز نہیں چاہیے' اپنے خوابوں کی شہزادی چاہیے مگر اس کی آواز گلے میں گھٹ کر رہ گئی۔

والدین کی مرضی کے آگے انور نے سرِ تسلیم خم کر دیا۔

بڑی دھوم دھام سے انور کی بارات نکلی۔ اس کے والد نے دل کھول کر خرچ کیا تھا۔ نعیم صاحب نے بھی بڑے شاندار پیمانے پر بارات کا استقبال کیا۔ باراتیوں کی وہ خاطر مدارات ہوئی کہ وہ عش عش کر اُٹھے۔

شام ڈھلے دلہن سسرال پہنچی۔ گاڑی کی آواز سنتے ہی لڑکیاں اور عورتیں گھر سے باہر نکل پڑیں۔ ایک نوخیز لڑکی آگے بڑھی اور کار کا دروازہ کھول کر سمٹی سمٹائی دلہن کو باہر نکالا اور اسے گود میں اُٹھا کر اندر لے گئی۔ لیکن جیسے ہی اس نے دلہن کو سیج پر لٹایا وہ لڑھک گئی اور گھونگھٹ اس کے سر سے سرک گیا۔

دلہن بے ہوش تھی۔

جلدی جلدی اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے گئے۔ کچھ دیر میں اسے ہوش آ گیا۔ انور کی امی دلہن کی بے ہوشی سے گھبرا گئیں۔ اور تقریباً چلاتے ہوئے بولیں۔

"ابھی دلہن تھکی ماندی ہے۔ اسے آرام کرنے دو۔" اتنا کہہ کر انہوں نے دلہن کے ساتھ آئی ہوئی اتابی کو چھوڑ کر باقی سارے لوگوں کو کمرہ خالی کرنے کا حکم دے دیا۔

رات کے لگ بھگ دس بجے ہوں گے کہ گھر کی عورتوں نے انور کو اندر بلوایا اور اسے چھیڑتے ہوئے، دھکے دیتے ہوئے حجلۂ عروسی کی جانب لے چلیں۔ ایک رشتے کی بھابھی نے ہنستے ہوئے کہا۔

"دلہن کو ذرا کم تنگ کرنا۔ بے چاری پھول سی نازک ہے۔"

انور کمرے میں داخل ہوا۔ ابھی وہ مسہری کے قریب بھی نہیں پہنچا تھا کہ دلہن بری طرح تھرتھرانے لگی اور ہاتھ پاؤں پٹکنے لگی۔ اسے اس حال میں دیکھ کر انور سہم گیا۔ پھر وہ کمرہ کھول کر بے تحاشہ باہر نکلا اور تقریباً دوڑتا ہوا اپنی امّی کے کمرے میں داخل ہوا۔ وہ سارے کاموں سے فراغت پا کر ذرا کمر سیدھی کرنے کو لیٹی تھیں۔ انور کو اپنے کمرے میں پا کر وہ بھی گھبرا کر اُٹھ بیٹھیں۔ انور ہانپتے ہوئے بولا۔

"امّی، امّی! نہ جانے دلہن کو کیا ہو گیا ہے۔ وہ بری طرح ہاتھ پیر اینٹھ رہی ہے۔"

اتنا سننا تھا کہ امّی دوڑتی ہوئی دلہن کے کمرے میں داخل ہوئیں۔ اس بھاگ دوڑ نے گھر کے سبھی لوگوں کو بدحواس کر دیا۔ کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ آخر ہوا کیا ہے۔ اتنے میں دلہن کی اتا بھی آ پہنچی۔ دلہن کی حالت دیکھ کر بے اختیار اس کے منہ سے نکلا۔

"لگتا ہے آج پھر دورہ پڑا ہے۔"

انور تیزی کے ساتھ ڈاکٹر کو بلانے چلا گیا۔

ڈاکٹر آیا۔ اس نے دلہن کا معائنہ کیا۔ ایک انجکشن لگایا۔ تھوڑی دیر بعد دلہن کی حالت سنبھل گئی۔ جاتے جاتے ڈاکٹر کہہ گیا۔

"انہیں مرگی کی شکایت ہے۔" ڈاکٹر کی بات سن کر انور بھونچکا سا اپنی امّی کو دیکھنے لگا۔

اس کی آنکھوں سے مظلومیت ٹپک رہی تھی۔

اور پھر سہاگ رات سے جو ڈاکٹر اور دوا کا چکر چلا تو پھر چلتا ہی رہا۔ دلہن کو مہینے میں دو چار بار دورے پڑ ہی جاتے اور انور کی پریشانیوں میں اضافہ ہو جاتا تاہم وہ اس کے علاج معالجے میں کوئی کوتاہی نہ برتتا۔ مگر اب ہر لمحہ اس کے ذہن پر خوف و ہراس کا سایہ رہنے لگا۔ ہر لحظہ ایک اضطراب کی کیفیت طاری رہتی مگر والدین کے آگے حرف شکایت زبان پر نہ لاتا۔ ہاں.....اب وہ اپنا زیادہ تر وقت گھر سے باہر گزارنا پسند کرتا۔ جب گھر آتا تو کھویا کھویا سا رہتا۔ اب اس کے لیے زندگی میں کوئی کشش باقی نہیں رہ گئی تھی وہ عجیب سی کشمکش میں مبتلا رہتا۔ اسے اپنے اردگرد کی ہر شے بیمار اور مدقوق دکھائی دیتی۔

ادھر انور کے والدین کو بھی احساس جرم کچوکے لگانے لگا بیٹے کا پژمردہ چہرہ دیکھ کر انہیں جہیز کے سامان بے وقعت لگنے لگے۔ بیٹے سے زیادہ بات کرنے کی ہمت بھی ان میں نہیں بچی تھی۔ تاہم کب تک۔ آخر ایک دن امّی نے دبی آواز میں کہنا شروع کیا۔

''بیٹے! ہم لوگوں نے تمہاری ایک معصوم سی خواہش کو کچل ڈالا۔ لالچ نے ہمیں اندھا کر دیا تھا۔ ہم نے تمہیں ایک عجیب مصیبت میں ڈال دیا ہے۔''

''کیسی مصیبت امّی؟'' انور انجان بن کر پوچھ بیٹھا۔

''کیا ہم دیکھ نہیں رہے ہیں۔ تم ہر وقت کھوئے کھوئے رہتے ہو۔'' امّی کے لہجے سے ہمدردی ٹپک رہی تھی۔

''نہیں امّی! میں تو بالکل ٹھیک ہوں۔''

''بیٹے! میں تو کہتی ہوں کہ تم رضیہ کو طلاق دے دو اور دوسری شادی.....''

''نہیں نہیں، یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔ میری قسمت میں جو تھا وہ مجھے مل گیا۔ اب میں دوسری شادی نہیں کروں گا۔'' انور کی معقولیت بھری باتوں کو سن کر امّی پر گویا گھڑوں پانی پڑ گیا۔ وہ خاموشی کے ساتھ کمرے سے باہر نکل گئیں۔

☆☆☆☆☆

مراجعت

■ نصف شب گزر چکی ہے۔ لیکن میری آنکھوں سے نیند کوسوں دور ہے۔ میں بار بار اپنی آنکھیں موند کر نیند لانے کی کوشش کر راہا ہوں، لیکن میرے اندر بدستور ایک خلجان موجزن ہے۔ میں بے چین سا کروٹیں لے رہا ہوں۔

یہ کیسی بے چینی ہے۔ یہ کیسا اضطراب ہے، جو میرے سارے وجود کو جھلسائے جارہا ہے۔ میری راتوں کی نیند حرام کیے ہوئے ہے اور ذہن کو مفلوج کیے ہے۔

دفعتاً خوف وحراس کی ایک تیز لہر میرے جسم کو جھنجھنا دیتی ہے۔ میرے اندر جھرجھری سی ہو رہی ہے۔ اور میں ہڑبڑا کر بستر سے اٹھ بیٹھتا ہوں اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا اس کمرے کی طرف بڑھنے لگا ہوں۔ جہاں میری سب سے چھوٹی مگر جوان بیٹی دنیا و مافیہا سے بے خبر سو رہی ہے۔ میں کمرے کے دروازے تک جاتا ہوں۔ لیکن اچانک ٹھٹھک جاتا ہوں۔ غیب سے ندا آتی ہے۔

''تم کیا کر رہے ہو.....؟''

''میں.....میں۔'' میں آپ ہی بڑبڑاتا ہوں۔ میں مضمحل سا لوٹ کر اپنے بستر پر آدھنسا ہوں۔ لیکن بدستور مضطرب ہوں۔ آخر آج میری ایسی حالت کیوں ہوگئی ہے۔ یہ تو میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔

کل ہی میں نے اپنی بوڑھی لیکن تجربہ کار آنکھوں سے اپنی بیٹی رضیہ کو دیکھا ہے۔ جو بالکل جوان ہوگئی ہے۔ اسکی ہر ادا اور چال ڈھال سے جوانی پھوٹی پڑی ہے۔ اس کی سانس کی حرارت بتاتی ہے وہ جوان ہوگئی ہے... بالکل جوان.....نہ جانے اسی گھڑی سے میں بے چین سا ہو گیا ہوں۔ کچھ کرتے دھرتے نہیں بنتا ہے۔ ہر لمحہ ایک انجانا سا خوف مجھے ستائے جارہا ہے اور جب میں کچھ

زیادہ سوچ لیتا ہوں تو مجھ پر وحشی پن سوار ہو جاتا ہے۔ اس وقت بھی مجھ پر وحشی پن حاوی ہے۔ اور میرے اندر کا وحشی درندہ مجھے کچھ کر گزرنے پر آمادہ کیے ہوئے ہے۔

اس وقت میری حالت ان وحشیوں کی طرح ہے جو آج سے صدیوں پہلے اس روئے زمین پر پھیلے ہوئے تھے۔

لیکن صدیوں کے بعد آج وہ وحشی پن میرے اندر کیوں کر سرایت کر گیا ہے۔ میں وحشی کیوں بن گیا ہوں۔ وہ تو جہالت کی بات تھی۔ لیکن آج تو میں عقیل وفہیم ہوں پر میری ایسی حالت کیوں ہے؟ آخر میں وحشی کیوں بن گیا ہوں۔ رضیہ کی انڈی ہوئی جوانی مجھے کیوں کھلنے لگی ہے۔ جبکہ میں نے اسے اپنا خون پسینہ ایک کر کے پالا ہے۔ اس بڑھاپے میں بھی محنت مزدوری کرنے جاتا ہوں اور دو وقت کی روٹی کا نظم کر لیتا ہوں۔ مگر آج مجھے اس کی جوانی کیوں بے چین کیے ہوئے ہے۔

اچانک میرے اندر کا وحشی درندہ جاگ اٹھا ہے اور میں پلنگ پر سے اٹھ کھڑا ہوا ہوں اور غیر ارادی طور پر پھر رضیہ کے کمرے کی طرف دھیرے دھیرے بڑھ رہا ہوں اور کمرے کے دروازے پر پہنچ کر رک گیا ہوں۔ اب بھی رضیہ پلنگ پر سوئی ہوئی ہے۔ اس وقت میرا قدم دروازے پر جم سا گیا ہے۔ اور چراغ کی مدھم روشنی میں میری بے نور آنکھیں متواتر رضیہ کو گھورے جا رہی ہیں۔

ہر طرف عالمِ ہو ہے۔ چاند بادل کی اوٹ سے جھانک رہا ہے۔ فضا پر اسرار ہے۔ جیسے زمانے کو سانپ سونگھ گیا ہو یا کوئی خوفناک درندہ اسے نگل گیا ہو۔

''کیا سوچ رہے ہو...؟''

''میں.....میں.....'' میرا حلق خشک ہو گیا ہے۔

''ہاں... ہاں تم...اب کسی کے نور کا ظہور نہیں ہوگا۔ بس ان کے چھوڑے ہوئے نقوش ہی کافی ہیں۔''

ندائے غیب سن کر میں پس وپیش میں پڑ گیا ہوں۔ چند لمحے تامل کے بعد مجھ پر پھر جنونی

کیفیت طاری ہوگئی ہے اور میرے اندر کا کٹر وحشی پن مجھے کچھ کر گزرنے کے لیے اکسانے لگا ہے اور میں بے سوچے سمجھے رضیہ کے کمرے میں دندناتے ہوئے جا گھسا اور پھر جھٹکے سے میرا خونی پنجہ معصوم رضیہ کی گردن پر جا پڑا۔ جانے کہاں سے آہنی سلاخوں کی سی سختی میرے ہاتھوں میں آ گئی ہے۔اور میں زور سے رضیہ کی گردن دبا دیتا ہوں۔

چند دبی دبی سی ہچکیاں ہوتی ہیں اور پھر تارِ نفس ٹوٹ جاتا ہے۔اور ساتھ ہی میں نڈھال ہو کر زمیں پر آ پڑا ہوں۔

☆☆☆☆☆
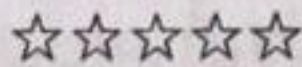
گرتوں کو تھام لے ساقی

■ شہزاد بھائی اور میرے گھر والوں کی پسند واقعی قابلِ رشک تھی۔ بڑی امی نے ان کا رشتہ ایک نہایت خوب صورت، ہنس مکھ اور چلبلی لڑکی سے طے کیا تھا۔ اور وہ تھی میری ہم جماعت زیب النساء جسے پیار سے زیبا کہا جاتا تھا۔

رشتہ طے ہوتے ہی شادی ہوگئی اور زیبا دلہن بن کر ہمارے گھر آ گئی۔ مجھے تو شادی کے دن سمٹی سمٹائی دلہن کے روپ میں زیبا عجیب سی لگی۔ وہی زیبا جو ہر وقت بجلی کی طرح اسکول میں چمکتی اور چہکتی رہتی تھی۔ آج گٹھری بنی اپنی انابی کے پہلو سے لگی تھی۔ سماجی بندھن اور وقت کی نزاکت بھی کیا چیز ہے کہ چھلاوے کے قدموں میں بھی بیڑیاں ڈال کر اسے رام کرلیا جاتا ہے۔

شادی کے دوسرے دن ہی میں اپنے شہر لوٹ آیا، جہاں میرے ابو ملازمت کے سلسلے میں رہتے تھے۔ ان دنوں میں بینک کی سروس کے امتحان میں مصروف تھا۔

کچھ دنوں بعد ہی بڑی امی نے خط لکھا کہ شہزاد بھائی اپنی دلہن کو لے کر جمشید پور چلے گئے۔ وہ وہاں ٹاٹا کمپنی میں میکنک کے پوسٹ پر ملازمت کر رہے تھے۔ انھیں ایک کوارٹر بھی ملا ہوا تھا۔

میں پی. او. کے امتحان میں کامیاب ہوگیا۔ ٹریننگ کے بعد میری پوسٹنگ بھی جمشید پور میں یونین بینک کے برانچ مینیجر کی حیثیت سے ہوئی۔ میں بہت خوش تھا کیوں کہ وہاں میرے شہزاد بھائی اور بھابی کے روپ میں زیبا بھی موجود تھی۔ سوچا، وقت اچھا گزرے گا۔

جمشید پور پہنچتے ہی شہزاد بھائی اور زیبا نے مجھے ہاتھوں ہاتھ لیا اور مجھے ایک کمرہ رہنے کو دیا۔ میرا خوب خیال رکھتے تھے۔ سوتے جاگتے، اٹھتے بیٹھتے وہ لوگ مجھ سے حال پوچھتے رہتے۔ شہزاد

بھائی کہتے۔ ''کوئی تکلیف تو نہیں؟ بھئی تمھارا ہی گھر ہے۔'' اور زیبا ہر وقت کھانے اور کپڑے کے پیچھے لگی رہتی۔ اور ''یہ کھالو، وہ کھالو، یہ سوٹ پہنو، وہ پہنو، یوں ٹائی لگاؤ، یہ چیز فائدہ مند ہے، یہ نقصان دہ ہے۔'' غرض میری خاطر داری میں دونوں نے کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا تھا۔

شہزاد بھائی مجھ سے پندرہ سال بڑے تھے لیکن زیبا تو میری ہم جماعت تھی اور شاید مجھ سے چھوٹی ہی ہوگی۔ لیکن ہمارے سماج میں ایک اصول بن گیا ہے کہ لڑکا چاہے جتنی عمر کا ہو، مگر اس کی شادی ہوگی تو کسی اٹھارہ بیس سال کی لڑکی سے ہی ہوگی۔ سو شہزاد بھائی نے بھی ویسی ہی شادی رچائی۔

میں جب شام کو ڈیوٹی سے لوٹتا تو زیبا بھائی صاحب کے ساتھ میرے نہانے کیلئے بھی نیم گرم پانی کا انتظام کیے رہتی اور پھر شام کا ناشتہ ہم سب اکٹھے کرتے۔ کبھی کبھی زیبا اسکول کے دنوں کی یاد تازہ کر دیتی تو اس کے ساتھ میں بھی ماضی میں غوطہ زن ہو جاتا۔ وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر یہاں تک کہ شہزاد بھائی سے بھی بے خبر ہو کر ماضی کو کریدنے لگتی اور کوئی نہ کوئی واقعہ سنانے لگتی۔

''انور، تمھیں یاد ہے نا وہ پکنک؟''

''ہاں آں....'' میں نے ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''ارے وہی جس میں میں نے تمھارے سالن میں الگ سے مرچ کا پاؤڈر ڈال دیا تھا اور تم نے جھنجھلا کر میری چٹیا پکڑ لی اور....'' اتنا کہہ کر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

آرام کرسی پر نیم دراز شہزاد بھائی اچانک اٹھ کھڑے ہوئے اور کسی دوست سے ملنے کے بارے میں کہہ کر باہر جانے لگے۔ لیکن زیبا اپنی ہنسی پر قابو پا کر بول اٹھی۔ ''ارے ابھی تو آپ نے پوری بات سنی بھی نہیں۔ بھئی وہ بھی کیا دن تھے۔ اتنی شاندار پکنک تو ہم نے کبھی نہیں منائی۔''

تھوڑے توقف کے بعد وہ بولی۔ ''جانتے ہیں، ہیڈ سر نے مجھ سے پوچھا تھا؛ مرغ تو چار تھے، مگر ٹانگیں صرف سات ہی ٹیبل پر آئیں؟ تو میرے منھ سے بے ساختہ نکل پڑا: سر، ایک مرغ ایک ہی ٹانگ کا تھا۔ اس پر سب لوگ ہنس پڑے تھے۔ معلوم ہے وہ ٹانگ کس کے پیٹ میں گئی؟ آپ کے انور صاحب کے...''

پھر زیبا اٹھ کر کھانا بنانے میں مصروف ہوگئی۔ زیبا کی دلچسپ باتیں مجھے اچھی لگتی تھیں۔ میں کچھ دیر کے لئے کالج کے دل کش ماحول میں کھوسا جاتا تھا۔

ایک دن شہزاد بھائی نے کسی کام کی غرض سے اوپر ٹیرس پر سے زیبا کو بلانے کے لیے مجھ سے کہا تو میں نے چھت کی آدھی سیڑھیاں طے کرکے اسے آواز دی۔ ''بھابی جان، نیچے بھائی صاحب بلا رہے ہیں۔'' اور پھر میں بینک چلا گیا۔ شام کو لوٹا تو یہاں عجیب فضا تھی۔ زیبا غیر معمولی طور پر گم سم اپنے کام کر رہی تھی۔ میں نہا دھو کر ناشتے کی میز پر جا بیٹھا۔ زیبا نے حسب معمول ناشتہ اور چائے میز پر رکھا، لیکن اس میں اور دنوں کی طرح مسرت و شادمانی نہیں تھی۔ اسے اس طرح چپ چپ دیکھ کر میں مضطرب ہو اٹھا اور میں نے اسے کریدنے کی کوشش کی۔

''بھائی جان نہیں لوٹے؟''

''آج شام کی شفٹ ہے۔'' اس نے مختصر سا جواب دیا۔

''کیا بات ہے آپ...''

''تو کیا کروں؟ شہنائیاں بجاتی رہوں؟ آج سے میں زیبا سے تمھاری بھابی جان بن گئی ہوں۔''

''تو آپ اس بات پر روٹھی ہوئی ہیں؟ حقیقی رشتے کو کبھی ٹھکرایا جاسکتا ہے کیا؟ یہ رشتہ تو کلاس کے رشتے سے زیادہ استوار اور حقیقی ہے اور پتھر کی طرح واضح بھی۔''

''بس رہنے بھی دو پچھلے دس گیارہ سال سے ایک دوسرے کا نام لیتے رہے اور آج پابندی۔'' اس کے لہجے میں تلخی تھی۔

''اچھا بابا، معاف کر دیجیے۔ آئندہ کوشش کروں گا کہ آپ کا نام ہی لوں مگر بھائی جان.....''

انھیں میں سمجھا لوں گی۔'' اس نے رسان سے کہا۔

''تو پھر مسکرا دیجیے، ورنہ دوبارہ.....''

'' آج میں جوبلی پارک کی سیر کرنے جاؤں گی۔ تم بھی چلو نا۔'' وہ پہلے کی طرح گلنار ہوگئی۔

زیبا کی بات ٹالنا میرے بس کی بات نہیں تھی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی مجھے حامی بھرنی پڑی۔ یوں تو میں جوبلی پارک کی سیر کرنے برابر جاتا تھا، لیکن زیبا کے ساتھ یہ پہلا موقع تھا۔

ہم دونوں نے کپڑے تبدیل کیے اور جوبلی پارک کے لیے چل پڑے۔ وہاں پانی کے رنگین فوارے چل رہے تھے۔ مصنوعی جھیل کے اندر جلے رنگ برنگے قمقمے آسمانی دھنک کی طرح دمک رہے تھے۔ لوگ ہر طرف چہل قدمی کر رہے تھے۔ میں نے بھی مونگ پھلیاں خریدیں اور جھیل کے کنارے جا بیٹھے۔ پھر گلابوں کے باغ کی طرف گئے۔ زیبا اپنی کلائی پر نظر دوڑاتے ہوئے بولی۔ ''ان کے آنے کا وقت ہو گیا ہے۔''

''ہاں، اب ہمیں چلنا چاہئے۔''

جلد ہی ہم لوگوں نے اپنے بسیرے کا رخ کیا۔ لیکن بھائی صاحب وہاں پہلے سے ہی موجود تھے۔ جانے کیوں مجھے عجیب سا لگا۔

''آج اچانک کہاں چلی گئی تھیں۔ قیامت ڈھانے۔'' شہزاد بھائی نے ذرا نداق کے انداز میں کہا۔

''یوں ہی، جوبلی پارک۔'' یہ کہہ کر زیبا کچن کی طرف چل دی۔

اس طرح ہفتے عشرے میں زیبا میرے ساتھ کبھی پارک تو کبھی شاپنگ کے لئے مارکیٹ چلی جاتی۔ لیکن بھائی صاحب کبھی کچھ نہ کہتے۔ شاید انھیں اپنی بیوی اور مجھ پر پورا ابھروسا تھا۔ شہزاد بھائی مجھے بچپن سے ہی کافی مانتے تھے۔

ایک دن پھر زیبا نے جوبلی پارک جانے کا اصرار کیا۔ اس روز بھی بھائی صاحب شام کی شفٹ میں تھے۔ پارک میں تھوڑی دیر تک ہم سیر سپاٹے کرتے رہے کہ اچانک زیبا کو کوئی پہچان والی مل گئی اور اس نے فلم جانے کی پیش کش کی اور بضد ہو گئی۔ مجبوراً زیبا کو حامی بھرنی پڑی اور مجھے بھی سنیما ہال جانا پڑا۔

شو ختم ہوتے ہی ہم نے کوارٹر کا رخ کیا۔ لیکن یہاں تک آتے آتے رات کے دس بج چکے تھے۔ خلاف معمول دروازہ کھلا ہوا تھا اور اندر سے کچھ لوگوں کی دھیمی دھیمی آوازیں آ رہی تھیں۔

میرے قدم بھاری بھاری ہو گئے اور زیبا ڈری ڈری سی سہمی سہمی سی اپنے بیڈ روم کی طرف جانے لگی۔

بیڈ پر شہزاد بھائی چت لیٹے تھے، لیکن ان کی آنکھیں دروازے پر ہی مرکوز تھیں۔ ان کے بائیں ہاتھ کے انگوٹھے پر پٹی بندھی تھی۔ پاس بیٹھے ہوئے پڑوسی سردار جی اور ان کی پتنی نے بتایا کہ بھائی صاحب کو کارخانے میں چوٹ لگ گئی ہے۔ پھر وہ لوگ اٹھ کر چلے گئے۔ بھائی صاحب غصے میں پھنک رہے تھے۔ سہمی سہمی سی زیبا ان کے سرہانے میں جا بیٹھی، لیکن شہزاد بھائی نے کروٹ بدل لی۔

''ہم تو شام کو ہی لوٹ رہے تھے، لیکن صوفیہ بھابی مل گئیں اور انھوں نے فلم...'' زیبا نے ممیانے کے سے انداز میں کہا۔

''تو جاؤ، ایک بار پھر نائٹ شو دیکھ لو۔''

''میں تو.....''

''میں تو کیا؟ تم حد سے تجاوز کر رہی ہو۔ تمھیں جو آزادی ملی ہے اس کا ناجائز فائدہ اٹھا رہی ہو۔''

میں اپنے کمرے میں بستر پر دراز ہو گیا۔ لیکن میرے کان بھائی صاحب کے بیڈ روم کی طرف ہی لگے تھے۔ بھائی جان زیبا کو ڈانٹتے رہے اور زیبا بھیگی بلی بنی سب کچھ سنتی رہی۔

دوسرے دن بھی ماحول بالکل پر اسرار بنا رہا۔ جیسے گھر کے خوش گوار ماحول کو سانپ سونگھ گیا ہو۔ اس ماحول میں مجھے گھٹن سی محسوس ہونے لگی۔

کئی روز تک پر اسرار ماحول بنا رہا۔ بھائی صاحب سے کچھ پوچھنے کی ہمت مجھ میں نہیں ہوئی اور زیبا تو گویا دن رات پلکوں پر آنسو سجائے رہتی تھی اور میں اس سے بھی تسلی کے جملے کہنے سے قاصر تھا۔

ایک دن بینک پہنچتے ہی مجھے ٹرانسفر لیٹر ملا۔ اسے دیکھتے ہی میں خوش ہو اٹھا۔ اور خوش خوش کوارٹر کو لوٹا۔ یہاں آ کر تو مجھے پیروں تلے کی زمین ہی کھسکتی ہوئی محسوس ہوئی۔ شہزاد بھائی آرام

کرسی پر نڈھال پڑے تھے اور زیبا اپنا سامان پیک کر رہی تھی۔

''بھائی جان، یہ سب کیا ہے؟'' میرے منھ سے بے ساختہ یہ سوال نکل پڑا۔

''ہاں، تمھاری بھابی کل اپنے میکے جارہی ہیں۔''

''لیکن کیوں؟''

''پوچھو اسی سے...'' بھائی جان کی سرخ آنکھیں اب بھی ان کے غصے کو نمایاں کر رہی تھیں۔''

''ارے میں تو بھول ہی گیا۔ بھائی جان، میرا تبادلہ ہو گیا ہے۔''

''کہاں؟'' آرام کرسی پر نیم دراز بھائی صاحب اچانک اٹھ بیٹھے۔ میں نے اپنا ٹرانسفر لیٹران کے آگے بڑھا دیا۔ ''میں کل یہاں سے روانہ ہو جاؤں گا۔''

''ارے سنتی ہو! یہ کہتا ہے، کل ہی چلا جاؤں گا۔'' بھائی جان اچانک موم بن گئے۔ سامان کی پیکنگ چھوڑ کر زیبا ہمارے قریب آگئی اور تینوں باتیں کرنے لگے۔

میں نے رات کو ہی اپنا سامان پیک کر لیا۔ دوسرے دن تڑکے میری آنکھ کھلی تو قدرے تعجب اور فرحت کا احساس ہوا۔ کیوں کہ زیبا کا پیک کیا ہوا سامان کھل کر پھر اپنی اپنی جگہ پر رکھا جا چکا تھا۔ ایک بار پھر مجھے گھر کا ماحول پہلے جیسا خوش گوار لگنے لگا۔

☆☆☆☆☆

رفّو میاں

■ میں نے جب سے ہوش سنبھالا رفو میاں کو ان ہی دو چار محلے کی گنی چنی گلیوں میں خاک چھانتے پایا۔ صبح ہو یا شام دوپہر ہو یا آدھی رات، شکم پروری کے لیے سرگرداں رہتے اور پیٹ بھرتے ہی خانقاہ کے ٹوٹے پھوٹے حصے میں پناہ گزیں ہو جاتے یا پھر بڑی درگاہ کے چبوترے پر ٹانگیں پھیلا دیتے۔ جوانی سے ہی گداگری ان کا پیشہ بن گیا تھا۔ لیکن یہ اور بات ہے کہ علاقہ کے اور گداگروں سے ان کا رویہ مختلف تھا۔ انھیں روپیہ پیسہ اور دھن دولت سے کوئی تعلق نہ تھا۔ ہاں دو وقت کی روٹی دو چار بیڑی مانگ لینا وہ اپنا حق سمجھتے اور کسی کے دیے ہوئے پھٹے پرانے کپڑوں سے تن پوشی کر لیتے۔ البتہ ان مطلوبہ اشیا کے نہ ملنے پر وہ محلے کے ہر دروازے پر جا کر اناپ شناپ بکتے اور کبھی کبھی چھتوں پر اینٹوں اور پتھروں کی بارش بھی کرنے لگتے۔ تنگ آ کر لوگ انھیں کھانا دے دیا کرتے۔

ان ہی وجوہات کے باعث لوگ انھیں پاگل، دیوانہ، سنکی اور نہ جانے کیا کیا کہتے۔ یہ الگ بات ہے رفو میاں، لوگوں کو ہی پاگل دیوانہ اور کم عقل سمجھتے۔

گرمی کے دنوں میں اکثر و بیشتر ہوا خوری کے لئے رفو میاں میرے بنگلے کے سامنے والے بنگلے پر آ جاتے اور نہ جانے کیا کیا آپ ہی بدبداتے رہتے۔ انھیں تنہائی میں بدبداتے دیکھ کر میں بھی ان کے قریب جا بیٹھتا اور انھیں چھیڑنے لگتا۔ کبھی ان کا میلا کچیلا تولیہ چھین لیتا تو کبھی ان کے بوشیدہ کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال دیتا۔ تنگ آ کر وہ مجھے بھی اول فول بکنے لگتے اور میں بے اختیار ہنس پڑتا۔ انھیں تنگ کرنے میں مجھے بے حد لطف ملتا۔

ایک روز میں انھیں تنگ کرنے میں لگا تھا کہ میری امّی کی نظر پڑ گئی۔ بس کیا تھا میری خوب

پٹائی ہوئی۔ جب سے میں نے رفو میاں کو تنگ کرنا بند کر دیا۔ تاہم ان کے پاس جا کر ضرور بیٹھتا اور سلیقے سے بات چیت کرتا۔ رفتہ رفتہ وہ مجھ سے مانوس ہو گئے۔

اس روز تو مجھے حیرت اور بے چینی ہوئی۔ اپنے بنگلے کے چبوترہ پر بیٹھا میں کسی رسالے کی ورق گردانی کر رہا تھا۔ تبھی رفو میاں آدھمکے اور آتے ہی میرے ہاتھوں سے رسالہ لے کر زور زور سے پڑھنے لگے۔ انھیں صحیح صحیح پڑھتے دیکھ کر میں مبہوت رہ گیا۔ یہ رفو میاں ہیں یا کوئی اور؟ مجھے اپنی آنکھوں اور کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ یہ وہی رفو میاں ہیں جو گلیوں اور سڑکوں پر مارے مارے پھرتے ہیں۔ شکم پروری کے لیے در در کی ٹھوکریں کھاتے پھرتے ہیں۔ چند لمحوں تک میں ان کے چہرے کو حیرانی سے تکتا رہا جس پر سرد و گرم تجربات نے جھریاں بکھیر دیں۔

''رفو میاں آپ تو پڑھے لکھے معلوم پڑتے ہیں پھر کوئی کام کیوں نہیں کرتے؟'' بے ساختہ میری زبان سے یہ سوال نکل پڑا۔

چند لمحے تجربہ کار نگاہوں سے مجھے گھورتے رہے، جس میں بلا کی معصومیت تھی۔

''کس کے لیے...؟ کون ہے میرا جس کے لیے کماؤں...؟'' انھوں نے سپاٹ لہجے میں کہا اور تیزی سے بدبداتے ہوئے آگے نکل گئے۔ اور میں بس انھیں جاتے ہوئے دیکھتا رہ گیا۔

اور کل ہی مجھے حقیقت معلوم ہوئی۔ کل میرے ایک دوست کا نکاح تھا، جس میں میں بھی خاص طور سے مدعو تھا۔ بعد نکاح طعام کا بھی اہتمام کیا گیا تھا۔ طعام کے تقریباً سبھی لوازمات تیار ہو چکے تھے۔ صرف نکاح ہونے بھر کی دیر تھی۔

نکاح پڑھایا گیا۔ دعائیں مانگی گئیں پھر سہرے پڑھے جا رہے تھے۔ لیکن ان سب باتوں سے بے نیاز میری نظریں دور کھڑے رفو میاں پر ہی مرکوز تھیں جو بڑے بے ہنگم طریقے سے کبھی اپنا سر کھجاتے تو کبھی بدن۔ میں سمجھا کہ ضرور رفو میاں کو بھوک ستا رہی ہے۔ انھیں اس طرح مضطرب میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

سہرا ختم ہوتے ہی میں وہاں سے اٹھا اور سیدھے رفو میاں کے پاس آ پہنچا اور ان کے ہاتھ پکڑ کر میں نے کہا۔

''کیوں رفو میاں کچھ زیادہ بھوک لگی ہے کیا؟''

''نہیں نہیں چھوٹے بابو...'' انھوں نے بے چینی کی حالت میں کہا۔

''اچھا چلو پہلے تمھیں کھلا دوں۔'' اتنا کہہ کر میں انھیں تقریباً کھینچتے ہوئے باورچی خانہ کے اندر لے آیا۔

''نہیں چھوٹے بابو آج کھانا نہیں کھاؤں گا۔'' انھوں نے پس و پیش کی۔ لیکن میں نے انھیں جبراً کھانے پر بیٹھا ہی دیا۔

ٹپ .... ٹپ .... آنسو کی دو موٹی موٹی بوندیں رفو میاں کی اداس آنکھوں سے ٹپک پڑیں۔ لقمہ والا ہاتھ بری طرح لرز رہا تھا۔ اور انھوں نے اٹھایا ہوا لقمہ بھی برتن میں رکھ دیا۔ اور ہاتھ دھو دھا کر کھڑے ہو گئے۔

پاس ہی کرسی پر بیٹھا میں رفو میاں کی اس غیر متوقع حرکت کا جائزہ لے رہا تھا۔ میں ششدر تھا کہ جس کے چہرے پر میں نے کبھی آنسوؤں کا شائبہ تک نہ پایا تھا آج آنسو... شدت جذبات سے مغلوب ہو کر میں کرسی سے اٹھا اور رفو میاں کے قریب جا کر ان کا ہاتھ تھام لیا۔

''رفو میاں کیا ہوا.... تمھاری آنکھوں میں آنسو...''

''کچھ نہیں چھوٹے بابو.....'' انھوں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''نہیں رفو میاں کچھ ضرور ہے۔ آج تمھیں سب کچھ بتانا ہوگا۔ آخر تم اس طرح کیوں زندگی گزارتے ہو؟'' میں نے رفو میاں کو باورچی خانہ کے ایک سنسان گوشے میں لے جاتے ہوئے کہا۔

تھوڑی دیر تک میں بضد رہا۔ انھیں چھیڑتا رہا، وجہ پوچھتا رہا۔ لیکن وہ گم سم ہی کھڑے رہے۔ تب میں نے انھیں جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔ ''رفو میاں آج تمھیں سب کچھ بتانا پڑے گا۔''

تب انھوں نے سپاٹ آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور اپنی زندگی کی تلخیاں اگلنے لگے۔

''چھوٹے بابو، کبھی میں بھی جوان تھا، ذہین تھا، بے باک تھا۔ لیکن بچپن میں ہی والدین کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ میں نے گاؤں میں ہی دکانداری کر لی تھی جس سے اچھی آمدنی ہو جاتی تھی۔

تبھی کسی نے شادی کی بات چھیڑ دی۔ میں نے بھی سوچا گھر والی آجائے گی تو گھر سنور جائے گا۔ پھر کیا تھا دھوم دھام سے میری شادی ہوئی۔ میں نے بیوی کو اپنا غم گسار سمجھا اور ساری چیزیں اس کے حوالے کر دیں۔ لیکن بات میرے خیال کے بالکل برعکس ہوئی۔ بیوی نے سسرال پر مائکے کو ترجیح دی اور آہستہ آہستہ گھر کی چیزیں مائکے لے جانے لگی۔ بیوی تو بیوی رشتہ داروں نے بھی مجھے خوب لوٹا۔ دکان سے ہر مطلوبہ شے لے جاتے اور لوٹ کر پھر اس کی قیمت ادا کرنے نہیں آتے۔ اور جب میں تقاضہ کرتا تو الجھ پڑتے۔''

''انجام کار میرا گھر کھوکھلا ہو گیا۔ تباہ و برباد ہو گیا۔ اور کمال تو یہ کہ میری تباہی و بربادی کا کوئی ردعمل میری بیوی پر قطعی طور پر نہیں ہوا۔ وہ خاموش تماشائی بنی میری ناکامی اور بے بسی کو دیکھتی رہی اور میں الجھتا ہی چلا گیا۔ مہاجنوں کا بہت سارا بقایا مجھ پر گر پڑا۔ یہاں تک کہ گھر بیچنے کی نوبت آن پڑی اور میں گھر بیچنے پر مجبور ہو گیا۔''

''ادھر میں نے گھر فروخت کیا اُدھر بیوی نے بچہ سمیت مائکے کی راہ لی۔ مجھ پر تو گویا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ ہفتوں بعد جب میں سسرال پہنچا تو سسرال والوں کا رویہ ہی کچھ اور تھا جس گھر میں میری خاطر داری میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھا جاتا تھا وہاں بے اعتنائی اور بے مروتی کا سامنا کرنا پڑا۔ وقت کے ساتھ ساتھ لوگ بھی بدل گئے۔ دن بھر میں سلگتا رہا۔ سرِ شام میرے سامنے طلاق نامہ تھا اور طوعاً و کرہاً مجھے اس طلاق نامے پر دستخط کرنا پڑا..... بس اسی دن سے... ہاں چھوٹے بابو اسی دن سے میں نے اپنی زندگی سے سمجھوتا کر لیا۔ اور ابھی جس لڑکے کا نکاح ہوا در اصل میرا ہی داماد ہو گا۔ لیکن میری حالت بھکاریوں جیسی ہے۔ اور میں اپنی بیٹی کے نکاح میں ایک بھک منگے کی حیثیت سے ہوں۔''

اتنا کہہ کر وہ رونے لگے۔

اور میں سر جھکا کر آرائش کے لیے لگائے گئے جلتے بجھتے قمقموں کو دیکھتا رہا۔

☆☆☆☆☆

چھوٹی بھو

■ چھوٹی بہو نے گھر میں قدم ہی رکھا کہ ساس اماں کا دماغ چوتھے آسمان پر چڑھ گیا۔ وہ خوشی سے پھولے نہ سمارہی تھیں۔ مہمانوں سے گھر کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ ساس اماں کبھی اوسارے میں چکر کاٹتیں تو کبھی کمرہ عروس میں جاتیں۔ چھوٹی بہو کی بلائیں لیتی، چومتیں اور فخریہ لہجے میں کہتیں۔

''کیا چاندسی بہو میرے گھر آئی ہے۔'' اور خراماں خراماں باورچی خانہ جا کر خانساماں کو سختی سے ہدایت دیتیں۔

''جمن میاں آج کھانا خوش ذائقہ اور خوب سے خوب تر ہونا چاہئے۔''

''مالکن آج کون سے آئٹمز پیش کروں؟'' خانساماں بھی لجاجت سے پوچھتا۔

''پتانہیں میری چھوٹی بہو کو کون سے آئٹمز مرغوب ہیں۔ خیر کھانے میں کچی بریانی، بٹیر کا قورمہ، قلیہ، مرغ مسلم، ماقوتی اور شیر مال بنوانا اور ہاں کریمن بوا تم اپنے ہاتھوں سے ہی بریانی بنانا۔'' ساس اماں نے مرغن کھانوں کی وضاحت کردی اور تیزی سے مہمانوں کی طرف لپکیں اور پڑوسن سے یوں ہم کلام ہوئیں۔

''دیکھو جی، اسلم کی امی کتنا سارا جہیز ملا ہے چھوٹے میاں کو۔ میری بہو لکشمی ہے لکشمی۔ اتنے سارے جہیز کے ساتھ ساتھ زیوروں سے بھی لدی پھندی ہے اور چاند سا مکھڑا۔ وہ آئی کہ میرے گھر کی رونق ہی بڑھ گئی۔'' ساس اماں مسرت آمیز لہجے میں مٹک مٹک کر بتارہی تھیں۔ لیکن دوسرے پل ہی منہ بسور کر بولیں۔

''ایک وہ فقیر زادی بڑے میاں کی بیوی جو خالی ہاتھ چاند سا مکھڑا لیے میرے گھر آئی۔ خوب صورت چہرہ لے کر آدمی چاٹتا ہے کیا؟ ارے جہیز کا سامان گھر کی رونق بڑھاتا ہے۔ دیکھنے

والے حسرت بھری نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ ٹھیک کہتی ہوں نہ بہن؟''

''ہاں.... ہاں بہن...'' بڑوسن نے بھی ساس اماں کو جذباتی دیکھ کر ہاں میں ہاں ملادی۔

بڑی بہو ساس اماں کی نظروں میں بہت ہی ذلیل و خوار تھی۔ ساس اماں اسے فقیر زادی سے ہی موسوم کرتیں۔ کیونکہ وہ تو اپنے ساتھ جہیز کے سامان میں معمولی سا گنا چنا سامان لائی تھی۔ آخر ڈھیر سارا سامان لاتی بھی کہاں سے؟ شیر خواری میں ہی ابا میاں کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ کمسنی میں والدہ محترمہ جنت الفردوس چلی گئیں۔ ایک بھائی تھے وہ بھی تقسیمِ وطن میں پاکستان چلے گئے اور تقدیر جلی غریب نانی اماں کے زیر سایہ رہ گئی۔ نانی اماں نے جوں توں کر کے ہاتھ پیلے کر دیے۔ قسمت کی ماری غربت سے ثروت میں بھی آئی تو چین وسکون نہ ملا۔ روزانہ ساس اماں کی لعن طعن ہی سنتے دن کٹ رہے تھے۔

دستر خوان بچھا دیا گیا۔ مرغن کھانوں کی قابیں چن دی گئیں۔ کسی میں کچی بریانی، کسی میں قورمہ، کسی میں قلیہ، کسی میں ماقوتی۔ غرض کہ ساس اماں کی ہدایت کے مطابق آئٹمز پیش کیے گئے۔ چھوٹی بہو خرام ناز سے پلنگ سے اتریں اور کھانے کی میز پر جا بیٹھیں۔

ڈائننگ ہال کے ایک گوشے میں کھڑی بڑی بہو حسرت و یاس بھری نگاہوں سے ٹکر ٹکر کھانے کی میز تک رہی تھی۔ تبھی ساس اماں نے کرخت لہجے میں کہا۔

''فقیر زادی دیکھ کیا رہی ہے؟ دوڑ کر غسل خانے سے صابن اور تولیہ لے آ.....''

بڑی بہو ہڑ بڑا کر ڈائننگ ہال سے بھاگی۔ جیسے ساس اماں نے اسے چوری کرتے دیکھ لیا ہو۔

اس طرح مسلسل چھ مہینے تک ساس اماں چھوٹی بہو کے لئے پلکوں سے زمین جھاڑتی رہیں، مداح بنی رہیں۔ لیکن ساتویں مہینے جب چھوٹے میاں گھر آئے تو بہو نے خیال ظاہر کیا کہ میں بھی آپ کے ساتھ جاؤں گی جہاں آپ مقیم ہیں۔ بھلا وہ بیوی کی باتوں کو کیونکر ٹالتے۔ فوراً منظور کر لی اور اپنی والدہ محترمہ سے اخلاقاً اجازت مانگی۔

''امی میرا خیال ہے چھوٹی کو ساتھ لیتا جاؤں۔''

ساس اماں کے سارے جسم پر مالش کی۔ انگیٹھی میں لگڑی کا برادہ دے دے کر لہکاتی رہی۔ ساس اماں کی تیمارداری کرتی رہی۔ مزاج پرسی کرتی رہی۔ ساس اماں چند منٹ میں ہی محوخواب ہو گئیں۔ لیکن بہو نے یہ رات آنکھوں میں ہی کاٹ دی، یہ سوچ کر کہ نہ جانے کس وقت ساس اماں کو اس کی ضرورت ہو۔

ساس اماں کا جسم مفلوج ہو گیا۔ ان کو لے کر بڑی بہو کی پریشانیاں بڑھ گئیں۔ ضعف کی وجہ سے وہ کھاٹ سے لگ گئیں۔

رشتے داروں یا ہمدردوں کی پہچان تبھی ہوتی ہے جب وہ اپنوں کے آڑے وقت میں کام آئیں۔ اس قول کے تحت بڑی بہو ہی ساس اماں کے آڑے وقت میں کام آئی۔ بڑی بہو نے ان کی دیکھ ریکھ میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھا تھا۔ پھر بھی چھوٹی بہو ساس اماں کی ورد زباں بنی رہی۔ ہر وقت چھوٹی بہو اور چھوٹے میاں کو بلا دو کی تسبیح پڑھتی رہتیں۔

بڑے میاں نے دوسرے دن ہی ایک خط چھوٹے میاں کے نام سپرد ڈاک کر دیا۔ لیکن کوئی جواب نہیں آیا۔ پھر پندرہ دنوں کے بعد ایک لفافہ بھی ارسال کیا گیا جس میں آنے کی تاکید کی گئی۔ پھر بھی نہ چھوٹے میاں آئے اور نہ ہی خطوط کا جواب ہی آیا۔ یہاں امی کی حالت دن بہ دن غیر ہوتی جا رہی تھی۔ امی نے جب بہت اصرار کیا تو بڑے میاں نے چھوٹے میاں کو ٹیلی گرام کر دیا۔

''مدر سیریس کم سون'' ٹیلی گرام ملنے پر چھوٹے میاں کو آنا ہی پڑا۔ دوپہر کی ٹرین سے چھوٹے میاں فیملی سمیت گھر آ گئے۔ اب چھوٹی بہو کی گود میں ایک بھولا سا بچہ بھی تھا۔ چھوٹی بہو اور اس کا ننھا سا بچہ دیکھ ساس اماں کی باچھیں کھل گئیں۔ جیسے ان کے نیم جان جسم میں کچھ جان سی آ گئی ہو۔ لیکن قہر تو یہ تھا کہ چھوٹی بہو نے اتنا بھی نہ پوچھا کہ امی اب کیسی ہو؟ وہ اس طرح سے پیش آئی کہ بیان سے باہر ہے۔ کھانا کھایا اور اپنے کمرے میں سو رہی۔ شام کے وقت جب اپنے بچے کو لیے ساس اماں کے کمرے کی طرف جا رہی تھی تو ساس اماں نے خود ہی چھوٹی بہو کو پکارا تب ساس اماں کے پاس جا کر کھڑی ہوئی۔ ساس اماں نے بڑے پیار سے کہا۔ ''بہو، بوا کو دو نا ہماری گود میں....''

''امی ابھی اس کو تیل مالش کروں گی، پھر کبھی....''

یہ کہتی ہوئی چھوٹی بہو کمرے سے نکلنے لگی۔ تبھی چھوٹے میاں نمودار ہوئے اور چھوٹی سے کہا۔ ''امی کو تیل مالش کر دونا...''

''ہم سے یہ نہ ہوگا..... کسی تیل مالش کرنے والی کو رکھ لیجیے۔'' چھوٹی بہو نے روکھے پن سے کہا۔

چھوٹی بہو کی ان تیز و تند باتوں کا شدید اثر ساس اماں کے دل و دماغ پر ہوا۔ جس کے لیے وہ ہر گھڑی جان چھڑکتی رہتی تھیں وہی آج ان کے ساتھ بے دردی سے پیش آئی۔ پھر بھی ضبط سے کام لیا۔

جب باورچی خانہ اور کھانے پینے سے بڑی بہو کو فرصت ملی تو ساس اماں کے کمرے میں آئی اور تیل مالش کر کے خواب گاہ میں چلی گئی۔

رات کے بارہ بج چکے تھے، فضا پر سکون تھی۔ ساس اماں کی آنکھوں سے نیند کوسوں دور تھی۔ چھوٹی بہو کی شام والی باتوں نے ان کے دل میں خلش پیدا کر دی تھی۔ جو بے حد عزیز تھی وہی بے مروت نکلی۔ وہ ان ہی خیالوں میں گم تھیں کہ ملحقہ کمرے سے سرگوشی سنائی دی۔ پھر کچھ تیز آواز ہوئی۔ ساس اماں سمجھ گئیں کہ یہ آواز چھوٹے میاں کے کمرے سے آ رہی ہے۔ کان دھر کر سننے لگیں۔ پل بھر میں مسئلہ حل ہو گیا۔ چھوٹے میاں اور چھوٹی بہو آپس میں بحث کر رہے تھے۔ چھوٹے میاں کہہ رہے تھے۔

''آئی تو اماں کا حال احوال تک نہ پوچھا۔ شام کو امی نے قمر کو دلار پیار کرنے کے لیے مانگا تو تم نے تیل مالش کرنے کا بہانہ بنا دیا اور جب میں نے کہا امی کو تیل مالش کر دو تو بپھر گئیں۔ پھر.....''

''پھر کیا؟ میں آپ کی بیوی ہوں دائی نوکر نہیں کہ جیسے کہیے ویسے چلوں۔ کیا اسی کے لیے میرے پاپا نے آپ کو دس ہزار روپئے اور اتنے سارے سامان دیے۔ قمر کی بات کرتے ہیں تو میں قمر کو کیسے ان کی گود میں دیتی۔ پتا نہیں انھیں کون کون سی بیماریاں ہیں۔ شاید میرے بچے....''

ساس اماں کو اس سے زیادہ نہ سنا گیا۔ کانوں پر ہتھیلیاں دھر لیں۔ شام سے جو زخم رس رہا تھا اچانک ابل پڑا۔ کلیجہ پھٹنے لگا اور گھبراہٹ میں بڑی بہو کو پکارنے لگیں۔

''بڑی بہو.... بڑی بہو....''

نیم خوابی میں بڑی بہو کے کانوں میں جیسے ہی ساس اماں کی آواز آئی معاً اٹھ بیٹھی اور تیزی سے ساس اماں کے کمرے میں جا پہنچی۔ بڑی بہو کو دیکھتے ہی ساس اماں بڑبڑانے لگیں۔ ''بہو معاف کر دو بہو.... میں نے تمھیں کبھی جی نہ لگایا۔ کاش.... تجھے سمجھنے کی کوشش کرتی۔ تجھے اپناتی۔ اس سونے کی گڑیا سے دل نہ لگاتی۔''

اتنا کہتے کہتے ساس اماں کی آواز گلوگیر ہو گئی۔

''امی یہ کیا کہہ رہی ہیں۔ الٹے آپ ہی معافی مانگ رہی ہیں۔ معافی تو مجھے مانگنی چاہیے.... میں آپ کو کبھی خوش نہ رکھ سکی۔''

''نہیں نہیں بہو... اب مجھے زیادہ شرمندہ نہ کرو.... آؤ نزدیک آؤ۔''

بڑی بہو ساس اماں کے سرہانے جا بیٹھی۔ ساس اماں نے اپنے نیم جان ہاتھوں سے بہو کا منھ چوما، جلدی جلدی بلائیں لیں اور بولیں۔ ''اللہ تم کو خو... خو... خوش رکھے....''

آدھا جملہ حلق میں ہی اٹک کر رہ گیا اور سر ایک جانب لڑھک گیا۔

''امی.... امی....'' بڑی بہو مضطرب ہو کر ساس اماں کو جھنجھوڑنے لگی۔ لیکن وہ جا چکی تھیں۔ وہاں جہاں سب کو جانا ہے۔

☆☆☆☆☆

کھرنڈ

■ آج پھر شرجیل نے اپنے پاؤں کے مندمل ہو رہے زخم کے کُھرنڈ کو غیر ارادی طور پر اپنے ناخن سے کھرچ ڈالا۔ کھرنڈ ہٹتے ہی جوانی کا تازہ خون فوارے کی طرح پھوٹ پڑا۔ زیادہ خون رستے دیکھ بستر پر بیٹھے بیٹھے ہی شرجیل نے اپنی ماں کو آواز دی۔ ماں دوڑ کر اس کے قریب پہنچی اور بیٹے کے جسم سے رستے خون کو دیکھ کر ایک دم سے آگ بگولہ ہو گئی۔ ''کتنی بار کہا کہ کھرنڈ مت نوچو لیکن تم تو عادت سے لاچار ہو۔ آخر تمہیں اس زخم کو بار بار تازہ کرنے میں کیا مزہ ملتا ہے۔ تم آخر کب تک اپنے آپ کو دکھ دے کر بیتے لمحوں کو یاد کرتے رہو گے۔۔ آخر اس کی بھی تو کوئی حد ہو گی۔''

واقعی شرجیل اپنے زخم کو کُرید کر ہی ماضی کے بکھرے تار پود کو سمیٹنے کی کوشش کرتا ہے۔ اور ماضی کے لق ودق صحرا میں وہ اپنے آپ کو بالکل اکیلا محسوس کرتا ہے۔ شرجیل جو اپنے جسم پر زخم لیے پھرتا ہے وہ اس کے دل کے زخم کے سامنے بالکل ہیچ ہے۔ کھرنڈ کو کھرچ کر ہی وہ ماضی کے شیریں و تلخ تجربات سے بھرے بیکراں سمندر میں غوطے لگاتا رہتا ہے۔

شرجیل اور سنبل کی ملاقات محض ایک اتفاق ہی تھی ۔ دونوں کی ملاقات ایک Physiotherapist کے یہاں ہوئی تھی۔ شرجیل اپنی ماں کو لے کر ہر روز وہاں جاتا تھا۔ اس کی ماں کا داہنا ہاتھ باتھ روم میں پھسلنے سے ٹوٹ گیا تھا۔ ہڈی تو جڑ گئی تھی لیکن ہاتھ کی کوئی نس کھینچ جانے کی وجہ سے ہتھیلی پوری طرح کام نہیں کرتی تھی۔ لہٰذا وہ ہر روز اپنی ماں کو Physiotherapy کرانے لاتا تھا۔ سنبل بھی Bells Paralysis کی شکار تھی۔ اس کے ایک کان میں درد رہتا تھا اور بات کرنے پر اس کا ہونٹ بائیں طرف کھینچ جاتا تھا۔ بولنے میں بھی لُکنت ہوتی تھی۔ لیکن Physiotheraphy اور Excercise سے دونوں ہی مریضہ کو کافی فائدہ پہنچ رہا

تھا۔ سنبل دیکھنے میں بہت خوبصورت تھی۔ وہ کم گو لڑکی تھی لیکن شرجیل اس کے سامنے کچھ اس طرح کی مضحک باتیں بولتا کہ سنبل بے ساختہ مسکرا پڑتی۔ سنبل روزانہ اپنے والد کے ساتھ اسکوٹر پر آتی تھی۔ سنبل کا گھر شرجیل کے گھر کے راستے میں پڑتا تھا۔ اس لیے کبھی کبھی جب سنبل کے والد کو کسی کام کی غرض سے جانا پڑتا تو وہ سنبل کو گھر تک چھوڑنے کی ذمہ داری شرجیل پر چھوڑ دیتے اور شرجیل کی والدہ سے التجا کرتے کہ اس کی بچی کو بھی ساتھ لیتی جائیں اور ایسا ہی ہوتا تھا۔ دھیرے دھیرے سنبل بھی شرجیل کو چاہنے لگی۔ اکثر شرجیل جب سنبل کو پہنچانے جاتا اور دروازے کے باہر سے ہی لوٹنے لگتا تو سنبل اس کی موٹر سائیکل کا ہینڈل پکڑ لیتی اور بغیر چائے پلائے نہیں چھوڑتی۔

سنبل کے سگھڑ پن، اس کے ملنے جلنے کے طریقے اور قبول صورتی پر شرجیل کی والدہ بھی فدا ہوگئی اور وہ دل ہی دل میں اسے اپنی بہو بنانے کی ٹھان لی۔ ایک ہی تو لڑکا شرجیل تھا۔ اس کے لیے وہ دیکھی بھالی لڑکی لانا چاہتی تھیں، سو سنبل میں وہ سارے گن موجود تھے۔ ایک دن اس نے دبی زبان میں سنبل کے والد سے بھی کہہ دیا کہ وہ اسے اپنے گھر کی بہو بنائے گی۔ سنبل کے والد نے بھی حامی بھر دی۔ شرجیل کی والدہ اور سنبل کی بیماری ایسی بیماری تھی جو دیر سے جانے والی تھی۔ دونوں کی Physiotherapy اور Exercise ہوتی رہیں۔ اِدھر بیماری بتدریج کم ہو رہی تھی اور اُدھر شرجیل اور سنبل کے بیچ پیار و محبت کا گراف دن بدن اوپر چڑھ رہا تھا۔ دونوں کی حالت ایسی تھی کہ ایک دوسرے کو دیکھے بغیر چین نہیں ملتا تھا۔ اسی دوران دونوں کی منگنی ہوگئی۔

ایک دن شرجیل کی والدہ کسی ضروری کام کی وجہ سے ورزش کے لیے کلینک نہیں آئی لیکن سنبل سے ملنے کی چاہت میں شرجیل کلینک آدھمکا۔ اس روز کلینک میں کافی بھیڑ بھاڑ تھی۔ سنبل کا نمبر پیچھے تھا اور سنبل کے والد کو بی شفٹ کام پر جانا تھا۔

اس لئے انہوں نے شرجیل سے کہا کہ وہ سنبل کو گھر چھوڑ دے گا اور وہ کام پر چلے گئے۔ شرجیل نے ویسا ہی کیا۔ وہ سنبل کو اس کے گھر چھوڑ دیا اور اس کی یادوں میں گم وہ اپنے گھر کی طرف آرہا تھا کہ اچانک اس کی موٹر سائیکل ایک ٹرک سے ٹکرا گئی۔ گاڑی ایک طرف گھسٹتی ہوئی کنارے چلی گئی لیکن شرجیل کا ایک پاؤں ٹرک کی زد میں آگیا۔ وہ بری طرح لہولہان ہوگیا۔ اسے راہگیروں نے پکڑا اور جلدی جلدی ایک آٹو رکشا پر لاد کر صدر ہسپتال پہنچایا جہاں ڈاکٹروں نے مل کر اس کا

علاج شروع کیا۔ لیکن اس کا ایک پاؤں اتنا کچل گیا تھا کہ اسے رکھنے سے شرجیل کی جان بھی جا سکتی تھی۔ اس لئے ڈاکٹروں کے بورڈ نے فیصلہ کیا کہ اس کی ایک ٹانگ کاٹنا پڑے گی۔ اور ایسا ہی ہوا۔ دوسرے دن شرجیل کو ہوش تو آ گیا لیکن اس کی بائیں ٹانگ اس کے جسم سے الگ ہو چکی تھی۔ وہ بہت چلایا بہت چیخا لیکن بے سود۔ شرجیل کی ایسی حالت دیکھ کر سنبل بھی بہت پریشان ہوئی۔ جب تک شرجیل ہسپتال میں بھرتی رہا وہ گاہے گاہے آ کر اس سے ملتی رہی، اسے تسلی آمیز جملے کہتی رہی۔ دو ماہ بعد شرجیل اپنے گھر آ گیا۔ اب وہ وہیل چیئر یا بیساکھی کے سہارے چلنے لگا۔ لیکن زخم کہیں کہیں پر اب تک ہرے تھے۔

ایک دن شرجیل اپنی ہونے والی شریک حیات سنبل کے بارے میں سوچ رہا تھا تبھی اس کے ایک دوست نے بتایا کہ سنبل کا رشتہ کہیں اور طے ہو گیا ہے۔ اور بہت جلد اس کی شادی ہونے والی ہے۔ یہ بات سن کر شرجیل کو ایسا لگا کہ کسی نے کھولتا ہوا سیسہ اس کے کانوں میں انڈیل دیا ہو۔ لمحے بھر کے لیے اس کا ذہن بالکل مفلوج ہو کر رہ گیا۔ لیکن اس نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے ٹیلی فون پر سنبل سے کانٹیکٹ کیا۔

''یہ میں کیا سن رہا ہوں۔ تمہاری شادی کہیں اور........''

ہاں آپ نے صحیح سنا لیکن اس میں میں کیا کروں۔ میں مجبور ہوں۔ والدین اور رشتہ دار یہی چاہتے ہیں۔ وہ کسی بھی طور پر نہیں چاہتے کہ میری شادی ایک اپاہج سے ہو....''

''تم کیا چاہتی ہو؟'' شرجیل غصے سے پھنک رہا تھا۔

''میرے چاہنے اور نہ چاہنے سے کیا ہو گا؟'' وہ سرے سے کنی کاٹ گئی۔

اتنا سننا تھا کہ شرجیل ٹیلی فون پٹک کر کریڈل پر رکھ دیا اور اپنا سر پکڑ کر دھم سے پلنگ پر گر کر دراز ہو گیا۔

اس طرح ہفتہ عشرہ کے اندر ہی سنبل کی شادی دوسری جگہ ہو گئی اور شرجیل دیکھتا رہ گیا۔ سنبل کا اس کی زندگی سے اس طرح چلے جانا اسے بہت کھلا۔ وہ تنہائی میں اکثر آنسو بہانے لگا۔ کچھ دنوں تک اسے کچھ بھی اچھا نہیں لگتا تھا۔ وہ بار بار اپنی کٹی ٹانگ دیکھتا تھا اور قدرت کے فیصلے پر آنسو بہاتا رہا۔ اس کی ماں ہر روز اس کے سر کو اپنی گود میں رکھ کر گھنٹوں سمجھاتی۔ دھیرے دھیرے شرجیل نارمل

ہوتا گیا۔ لیکن اس نے تہیہ کرلیا کہ اب وہ کسی سے شادی نہیں کرے گا۔

شرجیل بڑا ذہین اور محنتی لڑکا تھا۔ اس نے پہلے سے ہی بینک کے پروبیشنری آفیسر کا امتحان دے رکھا تھا۔ اچانک ایک دن اس کا جوائننگ لیٹر آگیا۔ اس کی اجاڑ زندگی میں ایک نیا موڑ آگیا۔ اس کی جس جگہ پوسٹنگ ہوئی تھی وہاں جا کر اس نے جوائن کرلیا۔ اب اس کی زندگی ایک نہج پر چل پڑی۔

وقت کا پہیہ چلتا رہا۔ لگ بھگ دو برس گزر گئے۔ ایک دن شرجیل اپنے برانچ میں کمپیوٹر کے سامنے بیٹھا ماؤس کی حرکت سے کوئی ڈاٹا نکال رہا تھا۔ تبھی ایک خاتون اس کے پاس آئی اور اس نے .F.D کے لیے فارم مانگا۔ شرجیل نے اس کی طرف نظر اٹھائی تو وہ ایک دم سے دنگ رہ گیا۔ سامنے سنبل کھڑی تھی لیکن اب وہ پہلے جیسی سنبل نہیں تھی۔ اس کا سرخی مائل چہرہ زرد پڑ چکا تھا۔ اس کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ چکے تھے۔ وہ ایک دم سے ڈھانچا بن کر رہ گئی تھی۔

''تم......'' شرجیل کا ہاتھ ماؤس پر سے خود بخود ہٹ گیا۔

''ہاں میں...... مجھے میرے کیے کی سزا مل گئی۔'' بولتے بولتے سنبل کی آنکھیں چھلک پڑیں۔ آنسو کے بے شمار قطرے اس کے چہرے پر آ گرے۔ رُندھی ہوئی آواز میں آگے گویا ہوئی۔

''ایک ٹرین حادثے میں میرے ہسبینڈ کی دونوں ٹانگیں جاتی رہیں''۔ اتنا کہہ کر وہ اپنے دوپٹے سے آنسو پوچھنے لگی۔

شرجیل کو محسوس ہونے لگا کہ سنبل کی باتوں سے اس کا دل پسیج رہا ہے اور سنبل کے تئیں اس کے اندر ترحمّ پیدا ہو رہا ہے۔ غیر ارادی طور پر اس کا بایاں ہاتھ حرکت میں آیا اور مندمل ہو چکے زخم پر جا پہنچا۔ اس نے ایک جھٹکے سے اپنے زخم پر پڑے کھرنڈ کو زور سے کھرچ ڈالا۔ اس کے زخم سے ٹیس اٹھی اور پورے جسم میں پھیل گئی۔ ساتھ ہی ماضی کی تلخ یادیں بھی اس کے ذہن میں فلیش کی طرح کوند گئیں۔ درد کو برداشت کرتے ہوئے اس نے اپنے ریوالونگ چیئر کو موڑا اور ایک اسٹاف کو آواز دی۔ ''کلکرنی دیکھنا ذرا ان کا .F.D سرٹیفیکیٹ بنا دینا۔''

اتنا کہہ کر وہ سنبل کو بغیر دیکھے اپنے چیمبر کی طرف بڑھ گیا۔

☆☆☆☆☆

سنبھالا

■ پروفیسر عارف نے غیر ارادی طور پر اپنی بیوی کی پیشانی کو چومنا چاہا تو ان کی بیوی نے جھٹکے سے انھیں اپنے سے الگ کر دیا۔ ادھر کچھ دنوں سے دونوں کے درمیان سرد جنگ چھڑی ہوئی تھی، جیسے کوئی مسئلہ درپیش آ گیا ہو۔

پروفیسر عارف سٹی کالج میں پوسٹیڈ تھے اور ان کی بیوی گرلز ہائی اسکول میں اسسٹنٹ ٹیچر تھیں۔ پروفیسر صاحب کا آبائی مکان کسی دیہاتی علاقے میں پڑتا تھا۔ لیکن ملازمت کے سلسلے میں اسی شہر میں قیام پذیر ہو گئے تھے۔

پروفیسر عارف بچپن سے ہی کافی ذہین تھے۔ ہمیشہ اپنے کلاس میں اوّل آتے تھے۔ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے انھیں پٹنہ آنا پڑا تھا۔ گھر کی مالی حالت زیادہ بہتر نہیں تھی اس لیے اپنی ضروریات پوری کرنے کے لیے دو چار ٹیوشن کرنے پڑے۔ ٹیوشن کے دوران ان کی ملاقات فوزیہ سے ہوئی۔ فوزیہ اس وقت بی۔ اے فرسٹ پارٹ کی طالبہ تھی اور عارف صاحب ایم۔ اے فائنل ایئر میں تھے۔

فوزیہ بڑی ہی شوخ، چنچل اور خوبصورت لڑکی تھی۔ لانبا قد، گورا چٹا اور فربہ اندام بدن، بڑی بڑی سرمگیں آنکھیں، ستواں ناک گویا حسن و جمال کا پیکر تھی۔ عارف صاحب کو پہلی نظر میں ہی وہ بھا گئی۔ تھوڑے دنوں میں ہی دونوں ایک دوسرے کے کافی قریب ہو گئے۔ پڑھنے پڑھانے کا سلسلہ چلتا رہا۔ عارف صاحب کو اپنی محنت کا پھل ملا اور ایم۔ اے میں ٹاپ کر گئے۔

امتحان پاس کرنے کے کچھ ہی دنوں بعد لکچر رشپ کی بحالی نکلی۔ عارف صاحب نے کالج سروس کمیشن کا انٹرویو فیس کیا اور کامیابی حاصل کر لی۔

جاب میں آنے کے چند مہینوں بعد ہی عارف صاحب نے فوزیہ کے ساتھ شادی رچالی اور فوزیہ کو ساتھ لے کر شہر چلے آئے۔ شب و روز اچھے گزرنے لگے۔ دونوں کی محبت کو دیکھ کر پاس پڑوس کے لوگ بھی رشک کرنے لگے۔

تقریباً پانچ سال بعد فوزیہ کی بھی جوائننگ بطور اسسٹنٹ ٹیچر ایک گرلز ہائی اسکول میں ہوگئی۔ اب تو ان دونوں کی زندگی کافی خوشگوار ہوگئی۔ گھر میں ایک ننھی سی بچی بھی پیدا ہو چکی تھی۔ اب عارف صاحب کو ایک ہی فکر تھی کہ اپنا کوئی مکان شہر میں ہو۔ یہ سوچ کر انھوں نے خالی اوقات میں ٹیوشن بھی پڑھانا شروع کردیا۔

پانچ برسوں کی جانفشانی کے بعد عارف صاحب نے اچھا خاصا روپیہ اکٹھا کیا اور پروویڈنٹ فنڈ سے Loan بھی لے لیا۔ اب ان کے پاس اتنا روپیہ پس انداز ہوگیا کہ اس مہنگے شہر میں زمین کا کوئی ٹکڑا خرید سکیں۔ لہٰذا انھوں نے نوآباد کالونی میں اپنے نام سے تھوڑی سی زمین خرید لی۔ اب وہ مکان بنانے کے بارے میں سوچنے لگے۔ لیکن اس جان توڑ مہنگائی میں زمین خرید کر اچھے شہر میں فوراً مکان بنانا مڈل کلاس کے لوگوں کے لئے ٹیڑھی کھیر تھا۔ عارف صاحب کے والد صاحب گزر چکے تھے اس لیے دو جوان بہنوں کی خانہ داری اور شادی کا ذمہ بھی ان کے سر تھا۔ سو وہ ہر ماہ کچھ رقم گھر بھیجا کرتے تھے۔

دونوں میاں بیوی بجٹ کے تحت گھر چلانے لگے اور ہر ماہ کچھ روپے پس انداز کرنے میں لگ گئے۔ پروفیسر عارف نے سوچا کہ ایک بار میں مکان بنانا بڑا کٹھن کام ہے لہٰذا انھوں نے تھوڑے روپے سے ہی مکان کی بنیاد ڈال دی۔ بنیاد ڈالنے کے بعد ہر دو تین ماہ کے وقفے میں تھوڑا کام ہوتا پھر روک دیتے۔

تقریباً تین برس کے اندر پروفیسر صاحب نے اپنے مکان کو بنیاد سے چھت تک پہنچا دیا۔ لیکن اب چھت ڈھلائی اور فنیشنگ کے لیے اچھی خاصی رقم درکار تھی۔ کیونکہ چھت ڈھلائی میں سیمنٹ، چھڑ اور مزدوری میں یکمشت خاصی رقم لگتی ہے۔ ادھر عارف صاحب کے پروویڈنٹ فنڈ میں اتنا روپیہ بھی نہیں تھا کہ مزید لون لیا جا سکے۔ انھوں نے پہلے سے ہی لون لے رکھا تھا جس کی

وجہ سے ہر ماہ ان کی تنخواہ سے طے شدہ رقم کٹ جاتی تھی۔ بڑے پلاٹ پر ایک بار میں فلیٹ نما مکان بنانا ایک مڈل کلاس کے آدمی کے لیے کافی مہنگا ہوتا ہے۔

پروفیسر عارف کے دماغ میں ایک بات آئی کہ کیوں نہیں فوزیہ کے پروویڈنٹ فنڈ سے روپیہ لون لے لیا جائے۔ ادھر مہینوں سے فوزیہ بھی اپنی تنخواہ بینک میں ہی رکھتی چلی آرہی تھی۔ پروفیسر صاحب نے سوچا اچھا ہے ایک بار چھت ڈھلائی کے موقع پر وہ روپئے نکال کر ان کو دے دیگی۔ مگر پروفیسر عارف کو کیا پتہ تھا کہ مہینوں سے فوزیہ کے اندر بدلاؤ سا آگیا ہے اور اس کے ذہن میں الگ ہی کھچڑی پک رہی ہے۔ مکان کی بنیاد پڑتے وقت اس کے اندر جتنی اپنائیت اور مسرت تھی وہ اب دھیمی پڑ رہی تھی۔ لیکن زبان سے کچھ بولتی نہیں تھی۔ ایک دن پروفیسر عارف نے محبت آمیز لہجے میں کہا۔

''ڈارلنگ، میں سوچتا ہوں کہ چھت ڈھلائی کروالوں....کافی کرایہ بھرنا پڑتا ہے....جلد ہی شفٹ کر جائیں گے۔''

''اچھی بات ہے.........''فوزیہ نے مختصر سا جواب دیا۔

''لیکن میڈم یہ کیسے ہوگا؟ بڑا لمبا Estimate ہے۔ اگر تم اپنا بینک والا روپیہ اور تھوڑا پروویڈنٹ فنڈ سے لون لے لو تو کام بن سکتا ہے۔''پروفیسر عارف نے اسے سمجھاتے ہوئے بڑی اپنائیت سے کہا۔

''نہیں نہیں یہ نہیں ہوسکتا۔ کیا میں اپنے مستقبل کے بارے میں نہیں سوچوں؟ مرد ذات کا کیا بھروسہ؟ میں اپنے پاؤں پر کھڑی ہوں تو اپنے بارے میں بُرے بھلے کے لئے روپیہ بھی تو بچا کر رکھوں گی اور پھر میری دو دو بچیاں......''فوزیہ نے بڑے روکھے پن سے کہا۔

پروفیسر عارف کو جیسے شاک سا لگ گیا۔ کاٹو تو خون نہیں۔ فوزیہ کی ان غیر متوقع باتیں سن کر وہ مضطرب و پریشان ہو گئے۔ شب و روز ان پر جان چھڑکنے والی فوزیہ اس طرح بے مروت نکلے گی یہ انھوں نے کبھی خواب و خیال میں بھی نہیں سوچا تھا۔ روپیہ کیا چیز ہے جو اپنوں کو بھی غیر بنا دیتا ہے۔ سارے رشتے ناتے پل بھر میں کافور ہو جاتے ہیں۔ اب جبکہ گھر ان دونوں کا بن رہا تھا

اور اس گھر میں زندگی بسر کرنی تھی تو پھر ایسی سوچ؟

تبھی پروفیسر عارف کی سمجھ میں ایک بات آ گئی کہ ان دنوں فوزیہ کا زیادہ تر اٹھنا بیٹھنا انجم کے ساتھ ہو رہا تھا۔ وہی انجم جو شادی کے بعد ایک بار بھی اپنے سسرال نہیں گئی تھی۔ بلکہ شوہر کو ہی تگنی کا ناچ نچاتی رہتی ہے اور اسے بار بار چھوڑنے کی دھمکی دیتی رہتی ہے۔ اسی سوچ میں پروفیسر عارف گم تھے۔ تبھی فوزیہ اپنے شانے میں بیگ ڈال کر اسکول جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس طرح جاتے دیکھ عارف نے کرخت لہجے میں اسے روکتے ہوئے کہا۔

''آخر کیا مطلب ہے تمہارا؟''

''یہی کہ زمین اور گھر میرے نام کر دیجئے۔'' فوزیہ نے لاپروائی سے کہا اور گیٹ کے باہر نکل گئی۔

پروفیسر عارف تذبذب میں پڑ گئے اور وہیں اپنا سر تھام کر صوفے پر بیٹھ گئے۔ وہ ماضی کی فوزیہ کو ڈھونڈھنے لگے اور سوچنے لگے کہ وہی فوزیہ جو ان پر جان چھڑکتی رہتی تھی اور ہر گھڑی اپنا سب کچھ نچھاور کرنے کو تیار رہتی تھی، آج اسے کیا ہو گیا؟ اپنے خاوند کی ذرا سی تکلیف برداشت نہیں کرنے والی اور فوراً بغیر دیر کیے ڈاکٹر کے پاس لے کر بھاگنے والی فوزیہ کو آخر کیا ہو گیا۔ اس کے اندر پتہ نہیں کیوں کر ایسے وسوسے پیدا ہوئے۔ پروفیسر عارف کا ذہن کام نہیں کر رہا تھا۔ پھر وہ بھی کالج چلے گئے۔

شام ڈھلے دونوں میاں بیوی گھر پہنچے۔ مگر بدستور سرد مہری بنی رہی۔ دونوں گم سم بیٹھے رہے۔ جیسے گھر میں کوئی آدم زاد ہے ہی نہیں۔ پوری رات یونہی خاموشی میں گزر گئی۔ یہاں تک کہ ڈائننگ ٹیبل پر بھی ایک ساتھ کھانا کھایا لیکن کسی نے ایک دوسرے سے بات چیت کرنے کی کوشش نہیں کی۔ دونوں ایک ہی بیڈ روم اور ایک ہی بیڈ پر سوئے۔ مگر غلطی سے بھی ایک دوسرے کے جسم نہ مس ہوئے اور نہ نزدیک آئے۔ پوری رات گویا دونوں نے ایک ہی کروٹ میں گزار دی ہو۔

صبح سویرے کام کرنے والی بوا آئی تب تک دونوں جاگ چکے تھے۔ جھاڑو برتن اور پونچھا لگا کر فارغ ہوئی تو فوزیہ کے پاس ٹیرس میں چلی آئی۔ وہاں فوزیہ بچی کو دودھ پلا رہی تھی۔ بوا

فوزیہ کے پاؤں کے پاس بیٹھ گئی اور گھگھیانے کے سے انداز میں بولی۔

''بی بی جی.... بی بی جی میرے مرد کو سمجھا دونہ بی بی جی....''

''کیا ہوا تیرے مرد کو......دماغ خراب ہو گیا ہے کیا؟''

''ہوا کچھ نہیں.....میں اس کو لے کر آپ کے پاس آؤں گی۔ آپ اس کو سمجھاؤ گی بی بی جی....آپ کو وہ نا نہ بولے گا''

''ارے کچھ بولے گی یا بی بی جی کی رٹ لگاتی رہے گی۔''فوزیہ نے زچ ہو کر کہا۔

''بی بی جی، ہم لوگ گھر کے لئے جمین کھرید رہے ہیں۔ میرا مرد کہتا ہے تیرے نام سے لوں گا۔ یہ کیسے ہوگا بی بی جی؟ مانا کہ میرے میکے کا تر کے کا روپیہ ملا ہے لیکن بی بی جی اس نے بھی تو رکشا کھینچ کر تھوڑا روپیہ جمع کیا ہے۔''

''ٹھیک تو کہتا ہے تو تو ایکدم بیوقوف ہے۔ ارے اپنے نام سے خرید لے۔ مرد ذات کا کیا ٹھکانا....کل کو چھوڑ دے گا تب؟''

''نا بی بی جی، یہ آپ کیا بولیں....میرا مرد میرے کو بہت مانتا ہے۔ آپ نہیں جانتیں۔ میرے کو سردی بھی ہوتی ہے تو وہ گھنٹوں میرے سر میں تیل ڈال کر سہلاتا ہے، پھر کاہے کو چھوڑے گا۔ کوئی کھراب کام کروں گی یا اس کی بات نہیں مانوں گی تب نہ بی بی جی....''

فوزیہ کو بوا پر غصہ آ رہا تھا۔ لیکن اس کے بھولے پن پر ترس بھی آ رہا تھا۔ تھوڑے توقف کے بعد بوا پھر گویا ہوئی۔

''بی بی جی، میرے مرد کے باپ کو بھی اپنا گھر نہیں تھا۔ ارے مرد کے نام سے گھر دوار ہوتا ہے بی بی جی تو اچھا لگتا ہے۔ لگتا ہے نہ بی بی جی؟ میں اسے پکڑ کر لاؤں گی، آپ اسے سمجھا دو گی نا.... میں آپ کے ہاتھ جوڑتی ہوں بی بی جی، پاؤں پڑتی ہوں....''

''اچھا جا تیری ضد ہے تو لانا۔''فوزیہ نے گویا اس سے جان چھڑائی۔

بوا تو اتنا کہہ کر وہاں سے چلی گئی۔ لیکن فوزیہ کو پوری طرح جھنجھوڑ گئی۔ بوا کی کہی ہوئی ایک ایک بات اس کے ذہن و دل پر ہتھوڑے برسانے لگی۔ دس بجے فوزیہ کاندھے پر بیگ ڈال کر

اسکول کے لئے روانہ ہوگئی۔ لیکن آج اس کا کہیں بھی من نہیں لگ رہا تھا۔ ٹیچرس روم میں بھی وہ خاموشی سے آئی اور چلی گئی۔ اس کا سر پھٹا جا رہا تھا۔ ایک گھنٹہ بعد ہی فوزیہ چھٹی کی درخواست دے کر اسکول سے چل دی۔

ٹھیک ڈھائی بجے دن میں فوزیہ اپنے گھر پہنچی۔ پروفیسر صاحب بھی اس وقت موجود تھے۔ فوزیہ کے وقت سے پہلے گھر آجانے پر پروفیسر صاحب کو بھی تعجب ہوا۔ لیکن لمحہ بھر میں ہی بات واضح ہوگئی۔

گھر میں قدم رکھتے ہی فوزیہ نے اپنے بیگ سے نوٹوں کے بنڈل نکال کر پروفیسر کے آگے سنٹر ٹیبل پر رکھ دیا اور مسکرا کر بولی۔ ''میرے اکاؤنٹ میں صرف سیکوریٹی منی بچی ہے۔ جلد ہی پروویڈنٹ فنڈ سے بھی کچھ روپئے نکال لوں گی''

پروفیسر عارف کو ایک بار پھر فوزیہ پہلے جیسی خوبصورت فوزیہ لگنے لگی جب وہ اسے بیاہ کر لائے تھے۔

☆☆☆☆☆

ہڑتال

■ ہڑتال! ہڑتال!! ہڑتال!!!

"ہماری مانگیں پوری کرو............انقلاب زندہ باد !"

پچھلے کئی مہینوں سے گنگا رام جوٹ مل میں بھی ہڑتال کا سلسلہ چل رہا تھا۔ پانچ دس دنوں کی کئی ہڑتالیں ہو چکی تھیں مگر ناکام رہیں۔ دنوں دن مزدور اور مالکوں کے بیچ کی کھائی پٹنے کے بجائے اور گہری ہوتی جا رہی تھی۔ یوں آسمان چھوتی ہوئی مہنگائی کی وجہ سے لگ بھگ سارے ڈپارٹمنٹ میں تنخواہ بڑھانے کے سلسلے میں ہڑتالیں ہو رہی تھیں اور مانگیں بھی پوری ہو رہی تھیں۔ لیکن گنگا رام جوٹ مل نے بہت دنوں سے مزدوروں کی تنخواہ میں کوئی اضافہ نہیں کیا تھا۔

مل مالکوں نے جب چھوٹی چھوٹی ہڑتالوں کو نظر انداز کر دیا اور کوئی نوٹس نہیں لیا تو مزدوروں نے مل جل کر یہ فیصلہ کیا کہ غیر معینہ مدت کی ہڑتال کی جائے اور پھر مانگیں پوری نہ ہوئی تو تشدد کی راہ اپنائی جائے۔

ہڑتال نے ایک نیا موڑ لیا اور مزدوروں نے مل کو مقفل کر کے بھوک ہڑتال اور دھرنا کا سہارا لیا۔ ان ساری کارروائی کے سرگرم عمل رہنما رگھوناتھ بابو تھے جو مل کے ایک سیکشن میں چارج مین تھے اور یونین کے لیڈر بھی۔ رگھوناتھ بابو کی پیٹھ پر دربان گلاب سنگھ تھا جو بڑا ہی گٹھیلا تھا۔ گلاب سنگھ رگھوناتھ بابو کو چاچا ہی کہتا تھا۔ رگھوناتھ جو کہتے اس پر گلاب سنگھ بے دریغ عمل کرتا۔ اب ہڑتال کے تقریباً چار ماہ گزر چکے تھے۔ اس عرصے میں سینکڑوں مزدوروں کے یہاں روٹی کے لالے پڑ گئے تھے۔ بہتوں نے پیٹ پالنے کے لیے چھوٹے چھوٹے دھندے شروع کر دیے تھے اور بہتوں نے قلی کباڑی کے کام شروع کر دیے تھے تا کہ اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ بھر سکے۔ ادھر مل مالکوں کے

کانوں پر جوں نہ رینگتی۔ وہ مزدوروں سے بات چیت تک کرنے سے گریز کرنے لگے۔

ادھر گلاب سنگھ بار بار اپنے لیڈر رگھوناتھ چاچا سے اجازت مانگتا رہتا کہ کیوں نہ مل کے کسی حصے میں آگ لگادی جائے یا مالکوں کے ساتھ تشدد کا حربہ استعمال کیا جائے۔ لیکن رگھوناتھ چاچا اسے یہ کہہ کر سرد کردیتے کہ وقت آئے گا تو میں خود ہی تمہیں کہوں گا۔

لمبی ہڑتال کا اثر گلاب سنگھ کے خاندان پر بھی پڑا کیونکہ وہ صرف رگھوناتھ چاچا کے پیچھے ہی چل رہا تھا۔ کوئی دوسرا دھندا شروع نہیں کیا تھا۔ آخر کب تک ایک دن اس نے رگھوناتھ چاچا سے دبی زبان میں کہہ دیا۔

''چاچا سوچتا ہوں کوئی دوسرا دھندا شروع کردوں، کافی کڑکی ہوگئی ہے۔''

''ارے تم نے پہلے کیوں نہیں کہا۔ تجھے دوسرا دھندا کرنا پڑے گا آخر تیرا یہ چاچا کس دن کام آئے گا۔ لے، تجھے کتنے روپئے چاہیے۔'' اور رگھوناتھ چاچا نے سوسو کے دس نوٹ اس کے ہاتھ پر رکھ دیے۔

گلاب سنگھ چاچا کی فراخ دلی پر کھل اٹھا اور اب تو پورے تن من سے چاچا کے پیچھے پیچھے ہی چلتا رہا چاہے جیسی میٹنگ ہو، رگھوناتھ اسے اپنے ساتھ ضرور لے جاتے۔

ایک دن دوپہر کا وقت تھا۔ اچانک کسی نے مل کے مالک تک یہ افواہ پھیلادی کہ مزدوروں نے مل میں آگ لگادی ہے۔ بس کیا تھا مل مالک نے تھانے میں رپورٹ کی اور پولس پارٹی کو لے کر مل پہنچ گئے۔

لیکن مل مالک کا اندازہ غلط نکلا۔ مل کے آس پاس بھی آگ زنی کی کوئی بات نہیں تھی۔ ہاں مل کے مین گیٹ پر مزدوروں کی گرما گرم سبھا ہو رہی تھی اور رگھوناتھ بابو اونچی آواز میں اپنی تقریر کر رہے تھے۔ اس وقت انکی تقریر نے سارے مزدوروں کو اپنی طرف متوجہ کرلیا تھا۔ جوں ہی مزدوروں نے مل مالک کو پولس والے کے ساتھ آکر رکتے دیکھا تو ان لوگوں کا غصہ ایک دم شعلہ کی طرح بھڑک اٹھا اور مزدوروں نے مالک کی کار پر پتھر پھینکنا شروع کردیا۔

پولس پارٹی نے جو یہ حال دیکھا تو اس نے بھی مورچہ سنبھالا اور ڈنڈے برسانے شروع

کردیے۔ ایک کرارا ڈنڈا رگھوناتھ بابو کو بھی جا لگا۔ بس کیا تھا گلاب سنگھ کا پارہ بالکل چڑھ گیا اور اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ لپک کر مل مالک کو دھر دبوچا اور گھونسوں کی بارش کردی۔

کئی گھنٹے کی مسلسل جدوجہد کے بعد پولس نے ہڑتالیوں پر قابو پالیا اور گلاب سنگھ کو قاتلانہ حملے کے جرم میں گرفتار کر کے لے گئی۔ لیکن اس حادثہ نے بہت ہی اچھا اثر چھوڑا اور مل مالکوں اور مزدوروں کے بیچ کی کھائی پاٹنے کی کوشش کی جانے لگی۔

رگھوناتھ کی مصروفیت اب اور بھی بڑھ گئی۔ پھر بھی وقت نکال کر وہ دو ایک بار گلاب سنگھ کو ڈھارس بندھانے کے لئے جیل خانے تک گئے تھے۔ رگھوناتھ چاچا کو دیکھ کر گلاب سنگھ بے فکر ہو جاتا۔ ہاں اس کی ایک ہی بنتی رہتی۔

''چاچا میرے بچوں اور چترا کا خیال رکھنا............''

مل مالکوں نے پندرہ دنوں کے بعد مزدوروں کے ساتھ مل کر ان کی مانگوں کو مدنظر رکھتے ہوئے فیصلہ کرنے کی تجویز پیش کی۔ سوموار کے دن یونین کے ممبران اور مالکوں کے بیچ میٹنگ بلائی گئی۔ مزدوروں کے نمائندے اور مالک ایک جگہ اکٹھا ہوئے اور گھنٹوں دونوں طرف سے ردوقدح چلتی رہی۔ فائلوں کی اٹھا پٹک ہوتی رہی۔ آخر کار انہیں مزدوروں کی لگ بھگ سبھی مانگوں کو منظور کرنا پڑا۔ اعلان کیا گیا کہ کل سے مزدور اپنے کام پر چلے آئیں۔ بس کیا تھا سارے مزدوروں میں امنگ اور ترنگ کی نئی لہریں امنڈنے لگیں۔ وہ لوگ خوشی سے پھولے نہ سما رہے تھے۔

لیکن اس خوشی میں کسی بھی ممبر یا مزدور کے لب پر گلاب سنگھ کا نام تک نہ آیا۔ سارے لوگوں نے اسے یکسر بھلا ڈالا۔

ہڑتال ٹوٹنے اور مزدوروں کی مانگیں پوری ہو جانے کی خوشخبری سن کر گلاب سنگھ ایک دم سے جھوم اٹھا۔ اور بڑی بے صبری سے رگھوناتھ چاچا کا انتظار کرنے لگا۔ اس کی آنکھیں جیل کے پھاٹک کی طرف ہی مرکوز رہتیں لیکن چوبیس گھنٹے گزر گئے رگھوناتھ چاچا کا کہیں پتہ نہیں تھا۔

دوسرے دن مہینوں سے بند پڑا مل کھلا اور معمول کی طرح سارے مزدور خوش خوش اپنے اپنے کاموں پر لگ گئے۔

ادھر گلاب سنگھ کی بیوی اور بچے دانے دانے کو ترس رہے تھے۔ کئی روز گزر گئے رگھوناتھ چاچا نہ تو گلاب سنگھ سے ملنے کے لیے جیل گئے اور نہ ہی اس کے گھر اس کے بچے کو دیکھنے کے لیے گئے۔ مجبور ہو کر گلاب سنگھ کی بیوی ہی ہمت کر کے رگھوناتھ چاچا کے گھر کا پتہ ڈھونڈ کر ان کے یہاں پہنچی۔

جس وقت گلاب سنگھ کی بیوی رگھوناتھ چاچا کے گھر پہنچی اس وقت رگھوناتھ چاچا اپنے کپڑے تبدیل کر رہے تھے۔ اور بڑی جلدی میں تھے۔ لیکن رگھوناتھ چاچا کو دیکھتے ہی چترا ایک دم سے پھپھک پڑی اور رو رو کر کہنے لگی۔

''چاچا ہڑتال تو کھتم ہو گئی مگر وہ نہیں چھوٹے...... چاچا بڑی مصیبت میں ہوں...... کچھ تو کرو چاچا......؟

''ہاں ہاں...... کیوں نہیں...... لیکن آج تو میں بہت جلدی میں ہوں۔ آج ورکروں کے درمیان بقایا رقم بٹوانا ہے۔ اور کہتے ہوئے رگھوناتھ چاچا رکشہ پر چڑھ کر مل کی طرف چل پڑے اور چترا امید بھری آنکھوں سے اپنے ہمدرد رگھوناتھ چاچا کو جاتے دیکھ رہی تھی۔ اسے خبر نہیں تھی اور شاید ہی کبھی خبر ہو پائے گی کہ مالک نے رگھوناتھ بابو سے سمجھوتے سے قبل ہی یہ شرط قبول کروالی تھی کہ گلاب سنگھ کے بارے میں کوئی بات نہیں ہوگی کیونکہ اس نے مالک پر ہاتھ اٹھایا تھا۔

☆☆☆☆☆

ڈوبتا سورج

■ جگدیش پور گاؤں میں ٹھاکر رندھیر سنگھ کا بول بالا تھا۔ ان کی زمینداری تھی اور اس کے ساتھ ہی وہ سارا رعب جو اس عہد میں ایک ڈھلے ڈھلائے حاکمانہ نظام میں خوب ہوا کرتا تھا۔ چنانچہ ٹھاکر رندھیر سنگھ بھی عام زمینداروں کی طرح رہا کرتے تھے۔ اور جگدیش پور کے لوگ سادگی کے ساتھ ایک روایتی سطح پر ان کے ہر سلوک کو گوارہ کرتے تھے۔

ٹھاکر رندھیر سنگھ نے بھی گاؤں والوں کو خوب ستایا اور جی بھر کے عیاشی کی۔ انگنت دوشیزاؤں سے کھیلا، بے شمار مانگیں اجاڑیں اور لاتعداد گھر جلائے۔

انھوں نے سر اٹھانے والوں کے سر کچل دیئے۔ آواز بلند کرنے والوں کی قوت گویائی سلب کر لی گئی۔ پولس ان کی تھی۔ اور گاؤں بھر میں آزادی کے ساتھ ٹھاکر کے اقتدار کی وحشت آوارہ پھرتی تھی۔ گاؤں کے جوانوں کے خون سرد ہو گئے تھے۔ کسی میں اتنی جرأت نہ تھی کہ ٹھاکر کے خلاف آواز بلند کرتا۔ کوئی ایک لفظ بھی اس کے خلاف آواز اٹھاتا تو ٹھاکر کے پیادے فوراً اسے حویلی لے جاتے اور ڈیوڑھی کے سامنے والے پاکڑ کے پیڑ سے باندھ کر خوب پٹائی کرتے۔ اس لیے گاؤں کے لوگوں نے خاموشی میں ہی اپنی بھلائی سمجھی۔

اب ٹھاکر کا جوش ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔ ان کی اعصابی قوت زائل ہو چکی تھی۔ ان میں اتنی طاقت نہ رہی تھی کہ شباب کی شراب پی سکتے۔ لیکن ہاں انھوں نے اپنے سارے عادات واطوار اپنے اکلوتے سپوت ٹھاکر بلونت سنگھ کو سونپ دیئے، جنھیں لوگ چھوٹے ٹھاکر کہتے تھے۔ چھوٹے ٹھاکر نے اپنے باپ کے نقش قدم پر چلنا پسند کیا۔ اور وہ سارے مشغلے انھوں نے اپنائے جو انھیں وراثت میں ملے تھے۔

وہ ایک سرسبز موسم تھا۔ اور گاؤں میں رنگ ہی رنگ بکھرے ہوئے تھے۔ دلوں پر بہار آئی ہوئی تھی۔ اور کھیتوں میں سرسوں کے پودے بھی پھولوں سے اٹے تھے۔ فضا میں بانکپن تھا۔ ٹھاکر کے باغ کی طرف جانے والی پگڈنڈی پر ایک دوشیزہ کناری دار دھوتی میں ملبوس گھاس کاٹ رہی تھی۔ اتفاق سے چھوٹے ٹھاکر کا گزر اسی پگڈنڈی سے ہوا۔ چھوٹے ٹھاکر اسے دیکھتے ہی فریفتہ ہوگئے۔ وہ لڑکی دامودر کسان کی اکلوتی بیٹی تھی۔

چھوٹے ٹھاکر اسے پھانسنے کی کوشش میں لگے رہے۔ آخر کار چند دنوں میں اس نے اپنے جال میں پھانس لیا وہ سادہ لوح لڑکی اس کی باتوں میں آگئی۔ بس کیا تھا ہر شام چھوٹے ٹھاکر اس کے ساتھ رنگ رلیاں مناتے رہے۔ اپنی ہوس پوری کرتے رہے۔ اور اسے طرح طرح کے بہلاوے دیتے رہے۔ اپنے نوکر سے گھاس کٹوا کر منگوادیتے۔ اور یہ لڑکی ان پر بچھی جاتی۔ کبھی کبھی تو شام کا دھندلکا پھیلنے پر گھر لوٹتی۔

شام ڈھلے جب گھر آتی تو دامودر مضطرب ہو کر کہتا۔ ''بیٹی چمپا تو اتّی دیر کا ہے کو کرت ہے؟''

''بابو جی، شاموکا کا کی بیٹی جیوتی ہے نا او کر اسے تنی بات کرت رہلی۔''

چمپا بہانے بنا کر نکل جاتی۔ دامودر کو کیا پتہ تھا کہ اس کی بیٹی چھوٹے ٹھاکر کے جال میں پھنسی سنہرے خواب دیکھ رہی ہے۔ اور چھوٹے ٹھاکر کبھی نہ بجھنے والی پیاس بجھا رہا ہے۔ اس معاملے میں دامودر ایک دم بے خبر تھا۔

تین مہینے اسی ہماہمی میں گزرے۔

موسم بہار اب اپنی تمام تر رنگینیاں اور خوشبوئیں بکھیر کر نہ جانے کہاں چھپ گیا تھا۔ سرسوں کے پھول مرجھا گئے۔ اور پودے میں بیج بھر آئے تھے۔ ہر طرف کا سماں اجڑا اجڑا سا تھا۔ پت جھڑ نے اپنا جال پھیلا دیا تھا۔ یعنی ہر طرف موسم سرما کی حکومت قائم ہوگئی تھی۔

ایک دن چمپا پریشان سی چھوٹے ٹھاکر سے ملی۔ چھوٹے ٹھاکر اسے سراسیمہ دیکھ کر نگاہِ ناز سے گویا ہوئے۔ ''تو کا ہے کو چنتا کرت ہے چمپا۔ ارے تو تو ہمار دل کی رانی ہے، رانی۔''

''ہاں چھوٹے ٹھا کر تو تو ٹھیک کہت ہو پر.....''

''پر کا چمپا.....؟ تہرا کا پتا آئل با جو تو ہمرا سے چھپاوت ہے۔''

''بات ای ہے چھوٹے ٹھا کر.....'' جملہ پورا بھی نہ ہوا کہ ابکائی ہوئی۔ وہیں کلیجہ تھام کر بیٹھ گئی۔ جب جی مچلانا کم ہوا تو اٹھی۔

''ٹھا کر ہم تہار بچے کی ماں....''

''نا.....نا.....تو جھوٹ کہت ہے۔'' چھوٹے ٹھا کر جھٹکے سے اس سے الگ ہو گئے۔

''ہم سچ کہت ہیں ٹھا کر....'' وہ ملتجیانہ لہجے میں بولی۔

''نا.....نا.....تو دوسر کے پاپ ہمرا پر تھوپت ہے۔'' اتنا کہہ کر ٹھا کر تیزی سے جانے لگا۔

''ٹھا کر.....ٹھا کر....'' چمپا چیختی چلاتی ہوئی ٹھا کر کی طرف لپکی۔ لیکن چھوٹے ٹھا کر اسے چھوڑ کر بے حسی سے آگے بڑھ گئے۔ چمپا کی آواز بانس کے پتوں کی کھڑکھڑاہٹ میں معدوم ہوتی چلی گئی۔ اور بے جان سی وہیں ڈھیر ہو گئی۔

ادھر چمپا کی کھوج میں دامودر ادھر ادھر بھٹک رہا تھا۔ جب وہ اسے گاؤں کے پوکھر اور کنویں پر نہ ملی تو وہ کھیت کی پگڈنڈیوں پر جا کر آواز دینے لگا۔ لیکن اس کی آواز کا جواب کچھ نہ ملا۔ سراسیمگی میں بے تحاشہ گرتے پڑتے پگڈنڈیوں پر دامودر بھاگتا جا رہا تھا۔ تبھی اسے کسی ملائم شے سے ٹھوکر لگی اور وہ گر پڑا۔ جب اس نے اس شے کو دیکھا، جس سے ٹھوکر لگی تھی تو دل برداشتہ ہو گیا۔ وہ شے اس کی اکلوتی بیٹی چمپا تھی جو بے حس و حرکت پڑی تھی۔ دامودر نے اپنی بیٹی کو کاندھوں پر اٹھایا اور گھر لا کر چارپائی پر لٹا دیا اور دوڑ کر ہسپتال سے ڈاکٹر کو بلا لایا۔

ڈاکٹر نے تشخیص کے بعد اظہار مسرت کرتے ہوئے کہا۔ ''پہلے مٹھائی کھلاؤ، تمھاری بیٹی ماں بننے والی ہے۔'' ڈاکٹر صاحب مسکراتے ہوئے چلے گئے۔ لیکن دامودر کو ایسا لگا کہ ڈاکٹر نے اس جملے کی آڑ میں بے شمار گھونسے اس کے دل پر جما دیے ہوں۔ وہ آگ بگولا ہو گیا۔ اس کے غصے کی انتہا نہ رہی۔ وہ تو چمپا کے ہوش میں آنے کا منتظر تھا۔ تبھی چمپا ہوش میں آ گئی۔ غصے میں لال دامودر اپنی بیٹی پر برس پڑا۔

''کلنکنی، تہرا یہی دن لا پوسلی۔ بول.... بول پاپن تو کگرا سے منھ کالا کرلی۔'' دیوانگی میں اس نے نہ جانے کتنے گھونسے اور تھپڑ برسا دیے اور چمپا گم سم پٹتی رہی۔

''بول بے لجّی..... تہرا پیٹ میں کگرا پاپ پلت ہے..... بول.........''

جب چمپا کا کلیجہ منھ کو آنے لگا تو اس نے راز اگل دیا۔ ''چھوٹے ٹھاکر''

نہ جانے کیوں چھوٹے ٹھاکر کا نام آتے ہی دامودر نے اپنے ہاتھ کھینچ لیے۔ اور نا معلوم خوف کی چادر اوڑھ کر پلنگ پر گر گیا۔

چمپا بھی آہیں بھرتی رات کے لمحے گننے لگی۔ اور تیسرے پہر ایک حتمی فیصلے کے تحت وہ گھر اور گاؤں کو خیر باد کر کے بے سمتی کی منزل طے کرنے لگی۔ صبح کے اجالے میں وہ اسٹیشن پر پہنچی۔ اتفاق سے اسٹیشن پر پورب کی طرف جانے والی گاڑی لگی تھی۔ وہ بے خوف و خطر گاڑی پر جا بیٹھی۔ گھنٹوں بعد گاڑی میں اس کے حواس جب درست ہوئے تو وہ ایک نا معلوم اسٹیشن پر اتر گئی۔ کیونکہ اس کے بعد گاڑی کو شاید آگے کہیں نہیں جانا تھا۔ اور سارے مسافر رفتہ رفتہ گاڑی سے اتر چکے تھے۔ یہاں تک کہ گاڑی خالی ہوگئی۔ چمپا مسافر خانے کے ایک گوشے میں جا بیٹھی۔ اسے اب سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے لیکن کوئی چارہ نہ چلا تو زار و قطار رونے لگی۔ تبھی کسی کی جھری دار ہتھیلی اس کے شانے پر پڑی۔ مڑ کر دیکھا تو ایک موٹی تازی لیکن عمر دراز عورت اسے ڈھارس بندھانے کو کھڑی تھی۔

''کاہے کو رو رہی ہو بٹیا؟'' بڑھیا نے بڑے بھولے پن سے کہا۔

''ماں جی....''

''ہاں ہاں..... سمجھ گئی.....کوئی نکھٹو مردوا تم کو چھوڑ دیا۔''

''ناماں جی.....ہمار بیاہ نہ ہولی..... پرنتو....''

''اچھا اچھا.... گھبراؤ نہیں چلو میرے ساتھ۔'' آگے آگے وہ عورت اور پیچھے پیچھے چمپا سہمی سہمی سی چل کر اس کے کوٹھے پر آئی جہاں وہ رہتی تھی۔ اس عورت نے اس کی دوا دارو اور مرہم پٹی کرائی۔ ساتھ ہی ساتھ اسے اس بوجھ سے بھی سبکدوش کر دیا جس کی وجہ سے اسے اپنا گھر چھوڑنا

پڑا تھا۔

چند دنوں میں ہی چمپا بھلی چنگی ہوگئی۔ لیکن یہاں بھی اس کا دم گھٹتا تھا۔ ہر طرف ہارمونیم کے سُر، طبلے کی تھاپ، سارنگی کی دھُن اور پائل کی جھنکار سے اس کے کان پھٹے جا رہے تھے۔

''بیٹی اس طرح رہوگی تو کیسے کام چلے گا؟ آخر پیٹ پوجا کے لئے تو کچھ کرنا ہی پڑے گا۔'' بڑھیا ہمدردی جتاتی ہوئی بولی۔

''ہاں ماں جی کون کام ہے؟''

''آؤ بیٹی ہم تم کو ناچنے کی کلا سکھائیں۔''

''او کلا سیکھ کے کا ہوئی ماں جی؟''

''پھر روپیہ کماؤ گی۔ لوگ تیرے ناچ گان دیکھنے آئیں گے۔''

''ناماں جی ہمرا سے ای کام نا ہوئی۔''

پہلے تو چمپا نے اس کام کو اپنانے میں گریز کیا لیکن آہستہ آہستہ اس پر بھی وہاں کے رنگ و روغن چڑھنے لگے۔ بڈھی بائی نے اسے ناچنے اور گانے کی کلا سے پُر کر دیا۔ چمپا ناچنے اور گانے میں بھی مشہور ہونے لگی۔ اس کا نام بدل کر چمیلی بائی رکھ دیا گیا۔

اب چمیلی بائی کی شہرت کا ڈنکا چہار طرف بج چکا تھا۔ لیکن چمیلی بائی تک آنے کی جرأت و ہمت بڑے بڑے سیٹھ ساہوکار ہی کر سکتے تھے۔ عام لوگوں کے بس کی بات نہ تھی۔ جو سیٹھ ایک بار اسے دیکھ جاتا تو بار بار آنے کا عادی ہو جاتا۔

چمیلی بائی کے جان لیوا ناز و ادا اور حسن صبیح کی خبر چھوٹے ٹھاکر تک پہنچی۔ چھوٹے ٹھاکر تو اول درجے کے عیاش تھے ہی جھٹ چمیلی بائی کے کوٹھے پر خبر بھجوا دی کہ کل جگدیش پور کے چھوٹے ٹھاکر اس کا مجرا دیکھنے اس کے کوٹھے پر آئیں گے۔

چھوٹے ٹھاکر کے یہاں آنے کی خبر سن کر چمیلی بائی کھل اٹھی۔ آج اس کے سجنے سنورنے کا انداز ہی کچھ اور ہی تھا۔ سورج ٹھیک سے مغرب کی طرف گیا بھی نہ تھا کہ وہ سج دھج کر تیار ہوگئی۔ خراماں خراماں گیٹ تک آتی جاتی رہی۔ تھوڑی دیر بعد چھوٹے ٹھاکر اپنے دو کارندوں

کے ساتھ شاہانہ انداز میں وارد ہوئے۔ چھوٹے ٹھاکر کو آتے دیکھ کر وہ سنبھل گئی اور گھونگھٹ کاڑھ کر اس نے چھوٹے ٹھاکر کا استقبال کیا۔

مجرا شروع ہوا۔ چمیلی بائی اپنے رقص کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ آج اس کے پاؤں میں بجلی بندھ گئی ہو۔ ترچھی نظروں سے چھوٹے ٹھاکر کی طرف دیکھتی اور لبھاتی رہی۔ اور چھوٹے ٹھاکر واہ واہی میں نوٹوں کی گڈیاں اچھال دیتے۔ مجرا ختم ہوا تو ٹھاکر نے حکم صادر کیا کہ اس کمرے میں سوائے چمیلی بائی کے کوئی نہ رہے گا۔ اور ایک موٹی رقم اس کھوسٹ کو دے دی، جس نے چمپا کو چمیلی بائی میں تبدیل کیا۔

چمیلی بائی تو اس تاک میں تھی ہی۔ فوراً جام و مینا لے کر بیٹھ گئی۔ بوتل کھل گئی جام خالی ہونے لگے۔ چھوٹے ٹھاکر بہت جلد نشے میں دھت ہو گئے اور چمیلی بائی کو اپنے بازوؤں کے حصار میں لے کر پڑ گئے۔ لیکن شراب کا خمار ٹوٹتے ہی نیند کا غلبہ ہوا اور محو خواب ہو گئے۔ چمیلی بائی اسے سوتا دیکھ کر فوراً آہستگی سے اٹھی اور عقب کے کمرے سے ایک تیز دھار چاقو اٹھا کر پہلے چوما۔ چاقو کا دستہ مٹھی میں جکڑ لیا اور چوٹ کھائی ناگن کی طرح پھپھکارتی ہوئی بڑی سرعت سے ٹھاکر کے نزدیک آئی۔ بس کیا تھا اس کے سینے پر تابڑ توڑ وحشیانہ حملہ کرنے لگی۔ اس کے ہاتھوں میں نہ جانے کہاں سے آہنی سلاخوں کی سی سختی آ گئی تھی۔ یکے بعد دیگرے نہ جانے کتنے چاقو چلا کر اس کے سینے کو چھلنی کر دیا۔ ٹھاکر کے سینے سے فوارہ کی طرح خون چلنے لگا اور ایک دلدوز چیخ مار کر لوٹنے لگا۔ ضرب کی تاب نہ لا کر چند منٹوں میں ہی تڑپ تڑپ کر مر گیا۔

اس کی چیخ سن کر کوٹھے کے سبھی افراد دوڑ پڑے۔ سبھوں کو جمع ہوتے دیکھ کر وہ کراہیت سے ٹھاکر کی طرف گھورتی ہوئی وحشیانہ قہقہے لگانے لگی۔

پولس کی گاڑی آئی۔ چمیلی بائی حراست میں لے لی گئی۔ اس کی مٹھی میں خون آلود چاقو موجود تھا۔ کپڑے پر جا بجا خون کے چھینٹے موجود تھے۔ پولس کے نزدیک شبہ کی کوئی گنجائش نہ تھی۔

چمیلی بائی پر خون کا الزام لگایا گیا۔ واقعات متعلقہ جرم کو ثابت کرنے کے لئے کافی تھے۔ چمیلی بائی کو عمر قید کی سزا ہو گئی۔

ادھر ٹھاکر کی حویلی سونی ہوگئی۔ چھوٹے ٹھاکر سے اب تک ایک بھی اولاد نہ تھی۔ بڑے ٹھاکر اور ٹھکرائن میں اتنی طاقت نہ رہی کہ حویلی کا چراغ دوبارہ روشن ہو سکے۔

چمیلی بائی اب تک قید خانے میں زندگی کے دن گزار رہی ہے۔ جب بھی کوئی جگدیش پور سے اس سے ملنے کے لئے آتا تو وہ وحشیانہ قہقہے لگاتی ہے۔ اور جوش بھری آواز میں کہتی ہے۔

''راون کا انت بھئیل۔ اب کوئی چمپا چمیلی بائی نہ بنی۔''

☆☆☆☆☆
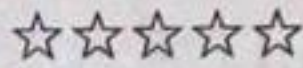
دل کی پھانس

■ دیگیں کھنک رہی تھیں اور دیگوں سے نکلتی ہوئی بھاپ فضا کو معطر کر رہی تھی۔ گھر اور اس کے ارد گرد کی گلیوں کو رنگ برنگے قمقموں سے سجایا جا رہا تھا۔ صحن میں شہنائیاں گونج رہی تھیں۔ مہمانوں سے گھر کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔

آج برات آنے والی تھی۔ لیکن دلہن نے جسم پر اُبٹن لگانے اور ہاتھوں میں مہندی رچانے سے انکار کر دیا۔ محلے کی عورتیں لوٹ کر اپنے گھروں کو جانے لگیں۔ آپس میں چہ می گوئیاں کرنے لگیں۔ یہ منظر دیکھ کر دلہن کی والدہ غصے سے بھڑ اٹھیں۔

''شاذیہ! آخر تجھے ہوا کیا جو عین برات کے دن مکر گئی؟ کیا خرابی ہے لڑکے میں؟ تیری عقل چرنے تو نہیں گئی؟''

'' کتنا ہونہار لڑکا ہے شکیل۔ ہزار ڈیڑھ ہزار ماہانہ تنخواہ۔ اور پھر تیری خالہ کا اکلوتا بیٹا ہے۔''

کچھ توقف کے بعد وہ کہنے لگیں۔ ''تمھیں سوچنا چاہئے، آج برات آنے والی ہے۔ کتنی ذلت ہوگی ہماری۔ ہم منہ دکھانے کے قابل نہ رہیں گے۔ بول بیٹی...''

اتنے میں والد بھی آدھمکے۔

''کیا بات ہے بیٹی شاذیہ؟ تو تو سمجھ دار لڑکی ہے۔ لیکن یہ کیا نادانی؟ خاندان کی عزت پر ایسا دھبا؟ برات گھر آکر لوٹ جائے، کتنی بڑی بے عزتی ہے! بیٹی، اچھی طرح سوچ لو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ بعد میں پچھتانا پڑے۔ شکیل جیسا لڑکا ہزاروں لاکھوں مِیں ایک ہے۔ اس قیمتی ہیرے کو نہ گنواؤ۔'' اتنا کہہ کر والد بھی سر کھجاتے ہوئے باہر چلے گئے۔

گھنٹوں والدین نے اپنی لاڈلی کو خوب سمجھایا بجھایا، لیکن شاذیہ کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی۔ وہ اپنی ضد پر اٹل رہی۔

والدہ شش و پنج میں پڑ گئیں۔ پھر نازیہ نے جو شاذیہ سے چھوٹی تھی، راز فاش کر دیا۔ اس نے بتایا کہ شاذیہ کل شام کو پچھواڑے کی گلی میں کامران سے باتیں کر رہی تھی۔ بس اسی وقت سے جانے کیوں وہ اس شادی سے انکار کر بیٹھی۔

والدہ سمجھ گئیں کہ یہ سازش اس مردود کامران کی ہوگی۔ کامران ان کا کرایہ دار تھا۔ ان دنوں شاذیہ اس سے کافی گھل مل گئی تھی۔ وہ چھوٹا موٹا اسمگلر تھا۔ اسمگلنگ سے اسے اچھی خاصی آمدنی ہو جاتی تھی۔

برات محلے میں داخل ہو چکی تھی۔ اس کے ساتھ ہی لڑکی کے والدین کی پریشانیاں بھی بڑھتی جارہی تھیں۔ شادی کا گھر ماتم کدہ میں تبدیل ہو گیا تھا۔ گھر والے عجیب کشمکش میں پڑ گئے تھے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کریں۔ اپنی جان دے دیں یا بیٹی کی جان لے لیں۔

اسی وقت ایک پڑوسن نے رائے زنی کی۔ ''نازیہ بھی تو اب جوان ہو چکی ہے۔ کیوں نہ اسی سے شکیل کی شادی کر دی جائے۔''

پڑوسن کی یہ رائے سن کر والدین کی جان میں جان آئی۔ والدہ نازیہ کو مایوں کے کپڑے پہنانے لگیں اور والد کو شکیل اور اس کے والد سے مشورے کے لیے بھیجا گیا۔

شاذیہ کے والد نے سمدھی اور نوشہ کو ایک طرف بلا کر نئی صورتِ حال سے آگاہ کیا اور بڑی منّت وسماجت کرتے ہوئے کہا۔ ''اب میری لاج آپ لوگوں کے ہاتھ میں ہے۔''

شکیل سمجھ دار لڑکا تھا۔ اس نے فوراً حامی بھر دی۔ کیوں کہ اس کا ہونے والا خسر کوئی اور نہیں، اس کا اپنا خالو تھا۔

اس طرح چھوٹی بہن نازیہ کی شادی شکیل کے ساتھ ہوگئی۔ سسرال والے اسے دل و جان سے چاہتے تھے۔ اسے یہ احساس بھی نہ ہوتا کہ وہ سسرال میں ہے یا مائکے میں۔

نازیہ کی شادی کے دو ماہ بعد شاذیہ کی شادی اس کی خواہش کے مطابق کامران

سے ہوگئی۔

وقت کے پہیئے چلتے رہے۔ شاذیہ اور نازیہ دونوں ایک ایک بچے کی ماں بنیں۔ بچے کو جنم دے کر نازیہ تو بہت خوش تھی، لیکن شاذیہ کی خوشی رخصت ہوگئی۔ شاذیہ اور کامران میں تلخی پیدا ہوگئی۔ جیسے شاذیہ نے ایک بچے کو جنم دے کر برا کیا ہو۔ اسی لیے تو کامران اس سے کڑھنے لگا۔ اب وہ زیادہ تر وقت بازاروں اور ہوٹلوں میں ضائع کرنے لگا۔ شاذیہ کی ہر چھوٹی سی چھوٹی غلطی پر وہ برس پڑتا۔ گلے کا ہار شاذیہ اب اس کے لیے کانٹے میں تبدیل ہوگئی۔ کبھی کبھی تو رات رات بھر دونوں ایک دوسرے سے کچھ نہ بولتے۔ یوں بھی شاذیہ اگر کامران سے باتیں کرنا چاہتی تو وہ صرف ہوں ہاں میں روکھے پن سے جواب دیتا۔ اس کا ملال شاذیہ کو بہت ہوتا، مگر کرتی کیا۔ یہ رشتہ تو اس کی مرضی سے ہوا تھا۔ والدین سے بھی اس کے متعلق کچھ کہنے کی ہمت نہ کرتی۔

ایک دن کامران رات گئے گھر آیا۔ وہ نشے میں دھت تھا۔ آتے ہی اس نے بے دھڑک پلنگ پر بیٹھنا چاہا، لیکن شاذیہ نے اسے جھٹکے سے الگ کر دیا۔ ورنہ اس کا ننھا سا بچہ اس کی زد میں آکر کچل جاتا۔

اس طرح شاذیہ کا جھٹکنا کامران کو ناگوار گزرا۔ نشے میں تھا ہی گھونسے اور تھپڑ کی بارش کر دی۔ جب شاذیہ سے نہ سہا گیا تو اس نے بھی خوب برا بھلا کہا اور اسے وہ دن یاد دلایا جب اس نے شکیل کو ٹھکرا کر اسے اپنایا تھا۔ لیکن اس کا اثر کامران کے دل و دماغ پر کچھ بھی نہ ہوا۔ اس کا تو شاذیہ سے دل بھر چکا تھا۔ وہ شاذیہ جیسی کسی اور لڑکی کی تلاش میں تھا۔ شاید مل بھی گئی ہو۔

صبح سویرے ہی کامران نے بریف کیس میں اچھے اچھے کپڑے بھرے اور شاذیہ کو کچھ روپئے تھما کر جانے کہاں جانے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔ اسے جاتے دیکھ کر شاذیہ تڑپ اٹھی اور دوڑ کر اس کے قدموں میں جا گری۔ اس کی آنکھوں سے گویا آنسوؤں کی برسات امڈ پڑی۔ وہ التجا آمیز لہجے میں کہے جا رہی تھی۔ ''آپ کہاں جا رہے ہیں ہم دونوں کو چھوڑ کر میری قسم.... بچے کی قسم ....بتائیے نا!''

لیکن بے رحم کامران نے اسے اٹھا کر صرف اتنا کہا۔ ''میں بزنس کے سلسلے میں باہر جا رہا

ہوں۔ بہت جلد واپس لوٹ آؤں گا۔"

بالکنی میں کھڑی شاذیہ بجھی بجھی سی کامران کو جاتے دیکھتی رہی۔ جب کامران اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا تو وہ مایوس ہو کر اپنے کمرے میں چلی آئی۔ اور ہارے ہوئے جواری کی طرح پلنگ پر بیٹھ گئی۔

دن، ہفتے، مہینے اور سال میں بدل گئے۔ دو سال گزر گئے۔ نہ تو کامران لوٹ کر آیا اور نہ خط سے ہی شاذیہ کی خبر لی۔ شاذیہ کو مجبوراً والدین کے سر کا بوجھ بن جانا پڑا۔ والدین نے اسے اپنی عزت سمجھ کر اپنا لیا۔

کامران کا ہرجائی پن شاذیہ کو گھن کی طرح کھانے لگا۔ وہ وقت سے پہلے ہی بوڑھی لگنے لگی۔ کبھی کبھی وہ اپنے بارے میں کچھ زیادہ سوچ لیتی تو دورہ سا پڑ جاتا۔

نازیہ نے جب اپنی بہن کے بارے میں سنا تو اسے اپنے یہاں بلا لیا۔

شاذیہ سہمی سہمی سی ہولے ہولے شکیل کے مکان کی سیڑھیاں طے کر رہی تھی۔ جانے کیوں وہ ہر سیڑھی پر چونک جاتی اور ادھر ادھر دیکھ کر قدم آگے بڑھاتی۔ شاید اسے ایسا لگ رہا تھا کہ کوئی اسے دھتکار دے گا، دھکے دے کر گھر سے باہر کر دے گا۔ اس کے دل میں ہوک سی اٹھ رہی تھی۔

ڈری ڈری سی وہ سیڑھیاں طے کر کے دہلیز تک جا کر دم لینے لگی۔ اس کی سانس بے طرح پھول رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ شکیل کے مکان کی سیڑھیاں نہیں، کسی بلند پہاڑ کے ٹیڑھے میڑھے راستے طے کر کے آئی ہو اور بلندی پر پہنچ کر تھوڑا دم لینے لگی ہو۔ وہ دہلیز سے آگے بڑھنے کی ہمت بٹور رہی تھی کہ نازیہ کسی کام سے وہاں آنکلی۔ اپنی بہن کو دیکھتے ہی وہ اس کے گلے سے لگ گئی۔

ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہی شاذیہ کمرے کی سجاوٹ میں کھو گئی۔ اسے ہوش ہی نہ رہا کہ نازیہ اسے کمرے میں بٹھا کر کمرے سے باہر چلی گئی ہے۔ اسے اس وقت ہوش آیا جب دوبارہ آکر نازیہ نے کہا۔ "آپا ہاتھ منھ دھو لو نا۔"

''اوں... ہاں!'' جیسے شاذیہ کسی خواب کی دھوپ چھاؤں میں بھٹک رہی ہو۔

ہاتھ منھ دھوکر شاذیہ اپنی بہن کے ساتھ ڈائننگ روم میں گئی۔ کھانے کی میز پر بھی بوجھل سی خاموشی طاری رہی۔ نازیہ ہی بیچ میں خاموشی کا گلا گھونٹتی تو شاذیہ ہوں، ہاں میں جواب دے دیتی۔

کھانے سے فارغ ہوکر شاذیہ ڈرائنگ روم میں آرام کرنے چلی گئی۔ گھنٹوں کروٹیں بدلتی رہی، لیکن اس کی آنکھوں میں نیند کہاں۔

''آپا شاید آپ بور ہورہی ہیں، چلئے نا تھوڑی سی چہل قدمی ہوجائے۔''

نازیہ کے اصرار پر وہ اٹھی اور اس کے ساتھ ہولی۔ نازیہ بشاشت بھرے لہجے میں بتائے جارہی تھی۔ ''یہ فریج ہم نے کلکتہ سے منگوایا ہے۔ اور یہ ٹی وی ان کے فرینڈ نے بمبئی سے لاکر دیا ہے۔ پریشر کوکر بھی انھوں نے ہی لاکر دیا ہے۔ آپا اس بار کلر ٹی وی لینے کا ارادہ ہے۔ کیسا رہے گا؟''

نازیہ چہک چہک کر شاذیہ کو دیکھے بغیر کہے جارہی تھی اور شاذیہ گم سم ٹکر ٹکر ہر چیز کو حسرت بھری نگاہوں سے تکے جارہی تھی۔

اسی وقت شکیل آگیا اور دونوں بہنوں کے درمیان آکھڑا ہوا۔

شکیل سے نظریں ملتے ہی شاذیہ ٹپٹا سی گئی۔ اس کے قدم ڈگمگانے لگے اور وہ پسینے سے شرابور ہوگئی۔ وہ فرش پر گرنے کو ہی تھی کہ شکیل نے اسے تھام لیا۔

اپنی بہن کی یہ حالت دیکھ کر نازیہ پریشان ہوگئی اور اپنی بہن کو جھنجھوڑنے لگی۔ لیکن زندگی سے بیزار شاذیہ بالکل بے حس وحرکت پڑی تھی۔ زندگی نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا تھا اور وہ اس دنیا کو خیرباد کہہ چکی تھی۔

☆☆☆☆☆
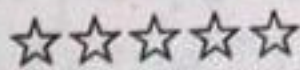
داغ داغ اجالا

آج گڈلک کا دل بلیوں اچھل رہا تھا۔ اس لیے نہیں کہ اس کی کوئی لاٹری نکلی تھی یا غیب سے خزانہ ہاتھ لگا تھا۔ بلکہ آج اسے ایک پارٹی اٹینڈ کرنا تھا۔ اور وہ بھی ایسے آدمی کے یہاں کی پارٹی جہاں کا اس نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ وہ مارے خوشی کے پھولے نہیں سمارہا تھا۔

دراصل اس کا نام گڈلک نہ تھا۔ اس کا اصل نام کچھ اور تھا۔ یہ نام اسے لوگوں نے اس کے ٹیلرنگ ہاؤس کی مناسبت سے دے رکھا تھا اور وہ اسی نام سے شہر میں مشہور ہوگیا۔ ہر آدمی اسے گڈلک سے ہی موسوم کرتا۔

گڈلک کا باپ بڑا تیز طرار آدمی تھا۔ وہ زمانے کے اتار چڑھاؤ اور بدلتے ہوئے رنگ ڈھنگ کو اچھی طرح سمجھتا تھا۔ خود تو وہ ایک معمولی ساراج مستری تھا لیکن اس نے زمانے کے فیشن زدہ ماحول کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنے بیٹے کے ہاتھوں میں کرنی بسولی کے بجائے گز اور قینچی پکڑا دی۔ پھر تو گڈلک نے اپنی تیز دھار قینچی سے اپنی قسمت پر پڑے سیاہ غلاف کو کھچا کھچ کترنا شروع کردیا۔ اس نے پہلے ایک چھوٹا سا ٹیلرنگ ہاؤس کھولا۔ اور کسی سے پوچھ تاچھ کر اس کا نام گڈلک رکھ دیا۔ پھر کیا تھا شہر کے فیشن زدہ نوجوان اس کے ٹیلرنگ ہاؤس کے گرد منڈلانے لگے اور اپنی اپنی پسند کے نئے ڈیزائنوں کے کپڑے سلوانے لگے۔ گڈلک بھی بڑا ذی شعور آدمی تھا۔ جیسے ہی کوئی نئی فلم ریلیز ہوکر شہر میں آتی وہ پہلا شو دیکھتا۔ فلم کیسی تھی کہانی کیا تھی اس پر وہ دھیان نہیں دیتا بلکہ اس کی نظر تو ہیرو اور ہیروئن کے لباس اور اس لباس کی تراش خراش پر ہوتی۔ اور پھر گھر آکر وہ اسی وضع قطع کی کاٹ چھانٹ کی مشق کرتا اور ہو بہو ویسے ہی اتار لیتا۔

ان دنوں نت نئے فیشن کی بیماری ہیضہ اور پلیگ سے بھی زیادہ تیزی سے معاشرے میں پھیلتی ہے۔ اور خاص کر نوجوان طبقہ اس مہلک مرض میں مبتلا ہوتا ہے۔ لیکن گڈلک کو اس بیماری سے خاصہ فائدہ ہوتا۔ لوگ اٹالین سے بیل باٹم اور بیل باٹم سے ڈسکو اور بیگی سے نیرو کی طرف سفر کرتے رہے اور گڈلک چپکے چپکے روپیہ بٹورتا رہا۔

اس نے دھیرے دھیرے اپنے ٹیلرنگ ہاؤس میں پچاسوں کاریگر رکھ لیے۔ اپنے دو چھوٹے بھائیوں کو بھی اس میں لگایا اور آرڈر پر آرڈر لینے لگا۔

اس طرح گڈلک دن دونی رات چوگنی ترقی کرنے لگا۔ اور بہت جلد اس نے ایک خوبصورت سا بنگلہ نما مکان بنالیا۔ اسکوٹر، ٹی وی اور فریج بھی لے لیا۔ اب اسے کسی بات کی کمی نہیں تھی۔

بیگ صاحب سے اس کی پہلی ملاقات سندھی ہوٹل کے ٹیپ روم میں ہوئی تھی۔ جانے کیوں بیگ صاحب کو دیکھ کر وہ ذرا جھجکا اور ان سے پرے ہٹ کر بیٹھ گیا۔ لیکن بیگ صاحب نے ہی اسے بلا کر اپنے قریب ہی بٹھایا۔ معلوم نہیں کہ بیگ صاحب کا حسنِ سلوک تھا یا پھر لال پری کا کرشمہ۔ بہر حال جو بھی ہو اسی دن سے گڈلک اور بیگ صاحب کی ملاقاتوں کا سلسلہ چل نکلا۔ بیگ صاحب اس سے یوں ملتے جیسے الیکشن کے وقت سیاسی لیڈر اپنے ووٹروں سے ملتے ہیں۔ اور گڈلک ان کے اسی حسنِ سلوک پر بچھ بچھ جاتا۔

اب بیگ صاحب کی تشریف آوری اس کے ٹیلرنگ ہاؤس تک ہونے لگی۔ ٹیلرنگ ہاؤس کے سامنے بیگ صاحب کی کار رکتے ہی گڈلک اپنی گدی چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوتا اور ان سے بغلگیر ہو کر انھیں اپنی گدی پر لا بٹھاتا۔ پھر چند منٹوں تک ادھر ادھر کی باتیں ہوتیں اور دونوں سندھی ہوٹل کو چل نکلتے۔ گھنٹوں بیگ صاحب کے ساتھ ٹیپ روم میں وہ خوش گپیوں میں مصروف رہتا۔

بیگ صاحب کی گرانقدر رائے پر اس نے اپنے دونوں بھائیوں کی دھوم دھام سے شادی کردی۔ پھر کچھ دنوں بعد دونوں بھائیوں کو اپنے ٹیلرنگ ہاؤس اور نئے تعمیر شدہ پختہ مکان سے دودھ کی مکھی کی طرح نکال پھینکا۔ جب دونوں بھائیوں نے اپنا اپنا حق مانگا تو گڈلک ایکدم سے

مکر گیا اور اپنی جائداد سے دونوں کو لاتعلق کر کے باپ کے بنائے ہوئے پرانے مکان میں بھیج دیا۔

دونوں بھائی گڈلک کے اس رویّے پر لال پیلے ہوگئے۔ اور گڈلک سے لڑنے کی ٹھان لی۔ اور ایک دن تو تو میں میں ہوتے ہوتے بات ہاتھا پائی تک پہنچ گئی۔ سامنے کی میز پر ایک تپا ہوا آئرن پڑا تھا۔ منجھلے بھائی نے اس آئرن کو اٹھا کر گڈلک پر دے مارا۔ وہ تو قسمت تیز تھی کہ آئرن منھ کے بجائے پیٹ پر لگا ورنہ پوری شکل ہی جھلس جاتی۔ گڈلک بھی مارے طیش کے اندر گیا اور بغیر لائسنس والا ریوالور نکال کر منجھلے بھائی پر نال سیدھی کر دی لیکن نشانہ چوک گیا۔

پھر مقدمہ بازی کا معاملہ درپیش آیا۔ آخر بیگ صاحب کس کام کے لیے تھے۔ فوراً آڑے آگئے اور بیچ بچاؤ کر کے دونوں بھائیوں کو تھوڑا تھوڑا روپیہ تھما کر معاملہ رفع دفع کر دیا۔ اس میں گڈلک کے دونوں بھائیوں کو صبر کر لینا پڑا۔ پتھر سے سر بھاری نہیں ہوتا۔

اب تک گڈلک اور بیگ صاحب کی ملاقاتیں بدستور ٹیلرنگ ہاؤس اور سندھی ہوٹل تک ہی محدود تھیں۔ ہاں گڈلک نے کئی مرتبہ اسے اپنے گھر پر مدعو کیا تھا۔ وقتاً فوقتاً یہ بات گڈلک کے ماتھے میں بھی دھیمی دھیمی آنچ کی طرح سلگتی رہی۔ لیکن پھر وہ اپنے آپ کو جھٹک دیتا۔

لیکن آج بیگ صاحب کی دعوت نے اسے آسمان کی بلندی پر جا بٹھایا۔ آج پہلا موقع تھا جب وہ بیگ صاحب کی حویلی میں قدم رکھے گا۔ بیگ صاحب کی حویلی کوئی ایسی ویسی حویلی نہیں تھی۔ بلکہ شہر کی ساری عزت و حشمت اسی حویلی میں اسیر تھی۔ دولت کی بھی ریل پیل تھی۔ گڈلک نے جذبات میں آ کر اپنے دونوں ہاتھوں کو ہوا میں لہرایا جیسے وقت کی تیز دھار میں اپنے آپ کو بدلنا چاہتا ہے۔

بیگ صاحب نے یہ دعوت بچے کی پیدائش کی خوشی میں دی تھی۔ جو آج سے چھ روز پہلے پیدا ہوا تھا۔ آج اس کی چھٹی کی رسم ادا ہونے والی تھی۔ حویلی کے دستور کے مطابق چھٹی کے دن اپنے پرائے سبھوں کو دعوت دینا لازمی امر تھا۔ لہٰذا بیگ صاحب نے بھی رشتہ داروں اور شہر کے باوقار لوگوں کو مدعو کیا تھا۔ ساتھ ہی گڈلک کو دعوت دے کر اپنے حسن سلوک کا مظاہرہ کیا تھا۔

حویلی کے صدر دروازے پر پہنچ کر گڈلک چند سکنڈ کے لئے ٹھٹکا پھر آہستہ آہستہ چھوٹے

چھوٹے قدموں سے حویلی کے اندر داخل ہوگیا۔حویلی کی سرزمین پر پاؤں دھرتے اسے ڈر لگ رہا تھا۔کہیں کوئی روک نہ دے،ٹوک نہ دے۔تبھی اس نے اپنے بے داغ لباس کا جائزہ لیا۔اور دندناتا ہوا وہ حویلی کے احاطے میں جا گھسا۔اندر طرح طرح کی گاڑیاں چمک رہی تھیں۔اور حویلی کی شان کو چار چاند لگا رہی تھیں۔گڈلک نے بھی اپنے اسکوٹر کو ایک طرف کھڑا کر دیا اور ہال کی طرف بڑھنے لگا جہاں بہت سے لوگ مشروبات سے سرشار ہو رہے تھے۔لیکن جوں ہی بیگ صاحب کی نظر اس پر پڑی تو بیگ صاحب نے بڑے خوش کن لہجے میں کہا۔آیئے...آیئے گڈلک صاحب۔میں تو آپ کا بہت بے صبری سے انتظار کر رہا تھا۔

بیگ صاحب کے منہ سے نکلے خیر مقدم کے شہد آگیں جملے سن کر گڈلک غبارے کی طرح پھول گیا۔لیکن ہال کے وسط میں گول میز پر رکھے لال کپڑے اور قینچی کو دیکھ کر گڈلک کا سارا وجود پگھلتا ہوا محسوس ہوا۔

''ادھر آیئے گڈلک صاحب،ایک چھوٹی سی رسم اپنے ہی ہاتھوں انجام دیجیے۔میں نے آپ کو خاص کر اسی لیے مدعو کیا تھا۔صرف بچے کا کپڑا تراشنا ہے،عورتیں سی لیں گی۔''

گڈلک کو یوں لگا کہ بیگ صاحب نے اسے بھری محفل میں گالی دے دی ہو۔اس کا سارا احساسِ فخر لمحہ بھر میں کافور ہوگیا۔اس نے ایک نظر ہال میں بیٹھے لوگوں پر دوڑائی تو اسے ایسا لگا کہ سب کے سب کہہ رہے ہوں کہ تم اس محفل میں اسی قابل ہو۔ورنہ کہاں بیگ صاحب اور کہاں گڈلک۔

یہ تو بیگ صاحب کی وضعداری تھی جو انھوں نے اس کے ساتھ دوستی کا ڈھونگ رچا رکھا تھا۔اور آج اس دوستی کا صلہ اسے مل رہا تھا۔

اور غیر ارادی طور پر گڈلک اس میز کی طرف بڑھ گیا جہاں قینچی اور کپڑے رکھے تھے۔اور چند سکنڈ میں ہی کپڑے کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔

☆☆☆☆☆

آزادی

وہ عمر کی آخری منزل پر پہنچ چکا تھا۔
اس کے سر کے سارے بال سفید ہو چکے تھے۔
چہرے پر جھریوں کا جال بچھ چکا تھا۔
سفید داڑھی کپاس کی فصل کی طرح لہلا رہی تھی۔

اس نے اپنی زندگی کا ایک طویل عرصہ کسی خاموش تماشائی کی طرح گزار دیا تھا۔ اب اس پر موسموں کا کوئی اثر نہیں ہوتا تھا کیا گرمی، کیا سردی' کیا برسات اور کیا بہار۔ اپنے مکان کے پچھلے حصے میں بنے ایک کمرے میں ہر شے سے بے نیاز وہ زندگی کے دن گن رہا تھا۔ دونوں وقت جو ملتا اسے پیٹ کی قبر میں دفن کر کے اللہ اللہ کیا کرتا۔ اب وہ کسی سے کوئی بات بھی نہ کرتا تھا' نہ کسی کے سوالوں کا جواب دیتا۔ وہ ایک متحرک لاش تھا۔

اس کی زندگی میں جو پھیکا پن اور سپاٹ پن آیا وہ ایک حادثے کا ردِ عمل تھا۔ یوں تو ہندوستان کو آزادی صدیوں کی جد و جہد' محنت اور قربانی کے بعد ملی لیکن اس آزادی کے دامن میں فرقہ وارانہ فسادت کے انگاروں نے جہاں لاکھوں گھروں کو خاک کیا وہیں بیشمار آدمیوں کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ ان ہولناک مناظر کی یاد آتے ہی آج بھی لوگوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

وہ بھی ایسے ہی ایک حادثے کا شکار ہوا تھا۔ اسُ کے دو بیٹے جو ایک ہی اسکول میں پڑھ رہے تھے بلوائیوں کی وحشت اور درندگی کی بھینٹ چڑھ گئے تھے۔ اس کا ہنستا کھیلتا گھر تباہ و برباد

ہو گیا تھا۔اس کے گھر کا دیا ہمیشہ کے لیے بجھ گیا تھا.....بس تبھی سے اس نے اپنی زندگی کے ساتھ ایک خاموش سمجھوتا کر لیا تھا۔وہ اب نہ ہنستا تھا نہ روتا تھا۔حالات نارمل ہونے کے بعد اس کے گھر والوں نے کئی ڈاکٹروں سے اس کا علاج کرایا مگر کوئی افاقہ نہ ہوا۔اسے دماغی امراض کے ماہرین سے بھی دکھایا گیا مگر سب بے سود۔خاموشی کی ردا اوڑھے وہ سدا کے لیے قوت گویائی سے محروم ہو گیا۔

ایک طویل عرصہ اپنے دامن میں شور، ہنگامہ، بے چینی اور اضطراب سمیٹے تیزی کے ساتھ گزر گیا۔مگر وہ ہر قسم کے شور سے بے نیاز اپنی کوٹھری میں چپ چاپ پڑا رہتا۔مگر ایک روز.....

مذہبی جنونیوں نے ملک کی فضا کو مکدر کر دیا تھا۔یہ جنونی رتھ پر سوار ہو کر شہر شہر آگ لگاتے ہوئے جب اس کے شہر میں داخل ہوئے تو دیکھتے ہی دیکھتے شہر کی فضا گرم ہو گئی۔ماحول کشیدہ ہو گیا۔بارود تیار تھا، بس آگ دکھانے کی دیر تھی اور جب بارود میں آگ لگی تو پورا شہر بھبھک کر جل اُٹھا۔بموں اور گولوں کے فلک شگاف دھماکوں اور انسانی چیخ پکار کو سن کر اچانک وہ اپنی کوٹھری سے باہر نکل آیا۔اور پھر بھاگتا ہوا اپنے چھوٹے بھائی کے دروازے پر آیا۔گھر کے بھی افراد اس کمرے میں دبکے شدت خوف سے لرز رہے تھے۔وہ تیزی کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا اور پھر برسوں کی خاموشی کو توڑتے ہوئے بول اُٹھا۔

''کیا ہندوستان پھر آزاد ہوا ہے......؟''

☆☆☆☆☆
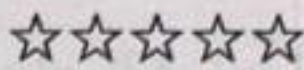
تپتی زندگی

■ گرمی بول رہی تھی۔ سورج سوا نیزے پر اُتر آیا تھا۔ پاگل دیوانی لُو، موت کا پیغام لیے دھول اور ریت کے ساتھ رواں دواں تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ آج دنیا جل کر بھسم ہو جائے گی۔ کوئی ذی روح باقی نہ رہے گا۔ ہرے بھرے درخت لُنڈ مُنڈ ہوتے جا رہے تھے۔ نرم نرم بیلیں سوکھ کر کانٹا سوئی جا رہی تھیں۔ لوگ اپنے اپنے گھروں میں مقیّد ہو کر بارش کی دعائیں مانگ رہے تھے اور وقتاً فوقتاً آسمان کی جانب منہ اُٹھا کر بادل کو تلاش کرتے مگر آسمان تو کسی بیوہ کی مانگ کی طرح سونا تھا۔

گرد و نواح کے سارے کنوئیں خشک ہو چکے تھے۔ ٹیوب ویل بھی سب خراب پڑے تھے۔ آدمی تو آدمی جانور بھی بے کل ہو کر پانی کی تلاش میں ادھر اُدھر مارے پھر رہے تھے۔ ایسے میں اگر کوئی اُمید کی کرن تھی تو وہ میونسپلٹی کی سپلائی لائن جو ہر روز دن میں دو بار کھل کر زندگی کی نوید دیتی۔ لوگ جلدی جلدی اپنے گھروں میں پانی بھر لیتے مگر شومیِ قسمت کہ وہ بھی گزشتہ دو روز سے بند تھی۔ سڑک پر لگے نلکے کے چاروں طرف بے شمار خالی گھڑے، بالٹیاں اور پانی بھرنے کے دوسرے برتن بھائیں بھائیں کر رہے تھے۔ پانی کے لیے لوگ آہ و بُکا کر رہے تھے اور گرمی تھی کہ مسلسل بولے جا رہی تھی۔ سورج بھی شدت غیظ میں شعلے اُگل رہا تھا۔ لوگ صبح ہوتے ہی شام ہونے کی دعائیں مانگتے لیکن نظام قدرت میں کوئی تبدیلی ممکن نہیں۔ ذرائع ابلاغ لُو سے مرنے والوں کی تعداد بتا رہے تھے۔ ہلاکتوں کا سلسلہ جاری تھا اور اس میں روز بہ روز اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

برداشت کی ساری حدیں ٹوٹ چکی تھیں۔ صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ لوگ ہجوم کی شکل میں میونسپلٹی کا گھیراؤ کرنے جا رہے تھے۔ وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ میونسپلٹی میں ہڑتال ہے..... کئی ماہ

سے وہاں کے ملازموں کو تنخواہ نہیں ملی تھی۔ واٹر سپلائی بند ہونے کا اصل سبب یہی تھا۔

اب جنگ کا نقشہ بدل گیا۔ دونوں فریق ایک ہو گئے اور پھر ایک بڑے جلوس کی شکل میں وہ لوگ ڈی۔ ایم کے آفس کی جانب روانہ ہو گئے۔ وہاں پہنچ کر زور زور سے نعرے بلند کیے جانے لگے۔ کلکٹر صاحب اپنے ایر کنڈیشن چیمبر سے باہر نکلے اور اس سمندری ہجوم کو دیکھ کر حواس باختہ ہو گئے۔ لُو کے تھپیڑوں نے جب ڈی۔ ایم۔ صاحب کے گالوں کے بوسے لینے شروع کیے تو وہ گھبرا کر اپنے چیمبر میں گھس گئے۔

تھوڑی دیر بعد ڈی۔ ایم۔ کا پی۔ اے باہر نکلا۔

میونسپلٹی ورکرس یونین کے نیتا اندر بلائے گئے۔ جلوس میں شامل چند عمر رسیدہ لوگ بھی اندر داخل ہو گئے۔ گفت وشنید کا دور شروع ہوا۔ ڈی۔ ایم۔ نے بارگیننگ کرنی چاہی۔ پیاسے لوگ بپھر اُٹھے۔ آخرش بڑی ردوقدح کے بعد نصف تنخواہ فوری طور پر ادا کرنے کا وعدہ کیا گیا اور باقی نصف قسطوں میں دینے کی بات طے ہوئی۔

معاملہ تو طے پا گیا مگر ڈی۔ ایم۔ صاحب اپنے چہرے سے ناگواری کے اثرات نہیں مٹا سکے۔

ہڑتال ختم ہو گئی۔

نصف النہار کا وقت تھا۔ سورج کی کرنیں برچھی کی انی کی طرح زمین میں پیوست ہوئی جاتی تھیں۔ ہواؤں کے تیز جھکڑ وحشی درندوں کی طرح محو رقص تھے۔ تبھی ایک خوشی بھری چیخ سنائی دی۔ ''پانی آ گیا۔''

اتنا سننا تھا کہ لوگ باگ اپنے اپنے گھروں سے نکل کر سڑک کے کنارے لگے نلکے کے اردگرد جمع ہونے لگے۔ اور پھر گھڑے سے گھڑا بجنے لگا۔ کوئی کہتا' پہلے میری باری ہے پہلے میں پانی لوں گا' کوئی کہتی' میرا گھڑا دو دن سے یہاں پڑا ہے' پہلے میں پانی لوں گی۔ اس بات پر اول تو تُو تُو میں میں ہوئی پھر ہاتھا پائی ہونے لگی۔ عورت جب اپنی دیگچی لگاتی تو مرد اسے اُٹھا کر پھینک دیتا اور جب مرد اپنی بالٹی لگاتا تو عورت اس کی بھری بالٹی میں ہاتھ ڈال دیتی۔ بڑی دیر تک یہی صورت حال بنی رہی لیکن جب دوسرے لوگوں نے چیخ پکار کی تو عورت دھیمی پڑ گئی اور پھر لوگ باری باری

سے پانی لینے لگے۔

تبھی ایک بوڑھا اور نحیف شخص کاندھے پر پھٹا پرانا جھولا لٹکائے اور ہاتھ میں چھوٹا سا کمنڈل لیے ہولے ہولے چلتا ہوا پائپ کے پاس آیا۔ اس کے پاؤں میں چھالے پڑے ہوئے تھے۔ میلا چکٹ کرتا پسینے سے شرابور تھا اس نے آتے ہی اپنے پپڑی جمے ہونٹوں پر اپنی خشک زبان کو پھیر کر گھگھیاتی ہوئی آواز میں کہا۔

''بابا تھوڑا پانی پلا دو۔''

''یہاں نمبر سے پانی ملے گا۔'' پھٹی پرانی ساری پہنے ایک عورت نے تیکھے لہجے میں کہا۔

''سویرے سے پیاسا ہوں بابا۔''

''کہہ دیا نا..... نمبر سے پانی ملے گا۔ لائن میں لگ جاؤ۔'' اس کی تیز آواز سن کر بوڑھا سناٹے میں آ گیا اور پھر سورج کی خاردار کرنوں سے بچنے کے لیے اپنے کاندھے پر لٹکے جھولے کو سر پر رکھتے ہوئے خاموشی کے ساتھ جا کر لائن میں لگ گیا۔

اب پانی کی دھار پتلی ہونے لگی تھی۔ بوڑھے کا نمبر سب سے آخر میں تھا۔ بوڑھا کبھی پانی کی دھار کو دیکھتا اور کبھی پانی بھرتے لوگوں کو اور کبھی سورج بھگوان کو جو آگ کے گولے کی طرح دہک رہے تھے۔

اچانک ہوا کا ایک تیز و تند جھکڑ آیا جس کی زد میں آ کر بوڑھے کے پاؤں اُکھڑ گئے اور وہ کسی کٹے ہوئے پیڑ کی طرح دھم سے زمین پر گر پڑا۔ بوڑھے کو زمین پر گرتے دیکھ کر تیکھی عورت کے دل میں ہمدردی کا جذبہ اُبھر آیا اور اس نے جلدی سے ایک چلّو پانی اس کے منہ پر ڈال دیا۔ ایک دوسری عورت نے اپنی بھری دیگچی اس کے ماتھے پر اُنڈیل دی لیکن بوڑھا تو بے حس و حرکت پڑا تھا۔

اس کی تشنگی مٹ چکی تھی۔ وہ تپتی زندگی سے نجات پا چکا تھا۔

☆☆☆☆☆
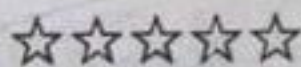
گرہن

■ ''کلموہی تجھے میں نے کیا کہا تھا۔ اگر بچّے کو کچھ ہوا تو تجھے زندہ جلا ڈالوں گی۔'' اندر کوٹھری سے نکل کر سجاتا نے جوں ہی اوسارے میں قدم رکھا تو اس کی ساس دہاڑ اٹھی۔

اور سجاتا پچھلے پاؤں ہی اپنا بڑا سا پیٹ لیے اندر کمرے کی طرف بھاگی۔ وہ کسی ضرورت کے تحت باہر جا رہی تھی۔ نہ جانے کس خیال میں وہ گم تھی اور بے خیالی میں آنگن کی طرف جانے لگی تھی۔ لیکن ساس کی کرخت آواز سن کر وہ سہم سی گئی۔ اور اندر کھاٹ پر آ گری۔

اس روز گرہن لگنے والا تھا۔ چاند پر مصیبت ٹوٹنے والی تھی۔ اس صدی کا سب سے لمبے وقفے کا گرہن تھا۔ راہو اور کیتو کے دل کھول کر بدلا لینے کی گھڑی آ رہی تھی۔ شام کے ٹھیک چھ بج کر پینتالیس منٹ پر چاند راہو اور کیتو کے نرغے میں آنے والا تھا۔ ہر مذہب کے پیروکار اپنے اپنے طور پر عبادت و ریاضت کرنے اور دان پن نیز خیرات زکوٰۃ دینے کے لیے تیار تھے تاکہ چاند پر آنے والی مصیبت میں کچھ تخفیف ہو۔

سجاتا کی ساس پرانے خیالات کی تھی۔ دوا دارو سے زیادہ جھاڑ پھونک اور جادو ٹونے میں وشواس کرتی تھی۔ اس لیے سجاتا اکثر و بیشتر اس کی ضعیف الاعتقادی کا شکار ہوتی رہتی۔ سجاتا ماں بننے والی تھی۔ چنانچہ سجاتا کی ساس کو جیسے ہی معلوم ہوا کہ چندر گرہن لگنے والا ہے اس وقت سے سجاتا پر کئی بندشیں عائد کر دی گئیں۔ اس کے کوٹھری سے نکلنے پر روک لگا دی گئی۔ اس کی ساس کی ہدایت تھی کہ وہ چپ چاپ بغیر بستر کی کھاٹ پر چت لیٹی رہے۔ نہ زیادہ ہلے ڈلے، نہ مٹھیاں بھینچے اور نہ آنکھ ہی بند کرے، نہ منہ پھاڑ کر جماہی لے۔ بس یوں ہی چپ چاپ لیٹی رہے۔ اور رام نام کا

جاپ کرتی رہے۔ کیونکہ ان سب کا برا اثر اس کے پیٹ میں پلنے والے بچّے پر پڑے گا۔ حتیٰ کہ سجاتا اپنی ضروریات سے فارغ ہونے کے لیے بھی کوٹھری سے نہیں جا سکتی تھی۔

ادھر سجاتا ساس کے عتاب سے پریشان تھی اور راہو اور کیتو اپنے اپنے قرض وصول کر رہے تھے۔ چاند دھیرے دھیرے گہناتا جا رہا تھا۔ ہر طرف سے رام نام کا جاپ شروع ہو چکا تھا۔ ساتھ ہی گھنٹے، ناقوس اور شنکھ کی آوازیں ایک دوسرے سے گڈمڈ ہو رہی تھیں۔ لوگ خشوع وخضوع کے ساتھ دان پن، خیرات وزکوٰۃ نکال رہے تھے کہ چاند پر آئی مصیبت جلد از جلد ٹل جائے۔ لیکن سجاتا جو جاپ کر رہی تھی وہ ایک التجا تھی، ناکردہ گناہوں کی سزا سے چھٹکارہ پانے کی التجا۔ اس کی بے بسی تھی، مایوسی تھی۔ اپنے لیے نہیں بلکہ اس کے پیٹ میں پلنے والے بچّے کے لیے۔ کہیں اس کا بچّہ ٹیڑھا میڑھا، اپاہج نہ پیدا ہو جائے۔ کہیں پیدائشی نابینا نہ ہو جائے۔ یا پھر ڈراؤنی شکل والا.... وہ اسی خوف سے اندر ہی اندر کانپ رہی تھی۔ اسے کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کرے تو کیا کرے۔ بے خیالی میں اس نے ساس کے حکم کے خلاف اسارے میں قدم رکھ دیا تھا۔ گھر پر اس کی ساس کا رعب داب چلتا تھا۔ اس سمے تو اس کا پتی دیو بھی پردیش میں براج رہا تھا۔ اگر وہ ہوتا اور چند تسلی آمیز جملے بھی اخلاقاً سجاتا سے کہتا تو اس کی ڈھارس بندھتی۔ لیکن اس وقت وہ اپنی ساس کے عتاب کا شکار تھی۔ اپنی ساس کے منع کرنے کے باوجود وہ باہر آگئی تھی۔

''اب کیا ہوگا.........؟'' کھاٹ پر چت لیٹی سجاتا پھپھک پڑی۔ اس کا ذہن بالکل سن ہو کر رہ گیا تھا۔ اس کی سوچ کا دائرہ گرہن اور اس کے اثرات اور اس کے پیٹ میں پل رہے بچّے تک سمٹ کر رہ گیا تھا۔ وہ اپنی سدھ بدھ گنوا بیٹھی۔

چاند پر آئی بلا ٹل چکی تھی۔ راہو اور کیتو اپنے اپنے قرض وصول کر چکے تھے اور جو کچھ باقی رہ گیا تھا اسے آئندہ کے لیے چھوڑ چکے تھے۔ چاند پھر اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ افق آسمان پر براجمان تھا اور اپنی ددھیا روشنی سے رات کی تاریکی کا جگر چیر رہا تھا۔ گھنٹے، ناقوس اور سنکھ کی آوازیں اب ماند پڑ چکی تھیں۔ دان پن خیرات وزکوٰۃ کی جھولی اب تنگ ہو چکی تھی۔ لوگ روزمرہ کے کاموں میں مگن ہو گئے تھے۔

اپنی ساس سے اجازت لے کر سجاتا حوائج ضروریہ سے فارغ ہوئی لیکن ایک انجانا سا خوف اس کی رگ رگ میں سمایا تھا۔ ڈری ڈری سی سہمی سہمی سی اپنی ساس کے چہرے کو گھورتی رہتی۔ اسے ہر پل ہر لحہ ایک ہی بات ستائے جارہی تھی کہ کہیں اس کے پیٹ میں پلنے والا بچہ گہن لگو نہ پیدا ہو جائے۔ اگر ایسا ہوا تو وہ کہیں کی نہیں رہے گی۔ سجاتا کے پورے دن تھے اور آج کل میں وہ ماں بننے والی تھی۔ سجاتا نڈھال سی کھاٹ پر لیٹ گئی۔ لیٹتے ہی ایک کرخت آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

''پڑی رہے گی کہ اشنان بھی کرے گی۔''

ساس کی آواز سن کر وہ ہڑ بڑا کر اٹھ بیٹھی اور اپنا بڑا سا پیٹ سنبھالتی ہوئی باہر آئی۔ نہ چاہتے ہوئے اسے ساس کی بات ماننا پڑی اور سرد رات میں اشنان کرنا پڑا۔ اس نے بھگوان سے لو لگائی۔ من ہی من اپنے بچّے کی سلامتی کی دعا مانگی۔ رات کے باقی اوقات اس نے گویا آنکھوں میں ہی کاٹ دیے۔ اس پر غنودگی چھاتی تو وہ الٹے سیدھے خواب دیکھنے لگتی۔ بار بار اس کی نیند اچٹ جاتی۔

ابھی پو پھٹا بھی نہیں تھا کہ ساس کی آواز پھر اس کے کانوں سے ٹکرائی۔ پہلے تو اس نے وہم سمجھا لیکن جب اس نے گردن موڑ کر دروازے کی طرف دیکھا تو سامنے اس کی ساس غصّے بھرے انداز میں کھڑی تھی۔

''جلدی اٹھ کرم جلی، بستر پر کیا پڑی ہے۔ تجھے بابا کے پاس لے جانا ہے۔'' ساس پاؤں پٹکتی ہوئی آنگن میں پہنچی اور مونڈھے پر جا بیٹھی۔ سجاتا کی ساس کو بہو کی فکر نہیں تھی۔ اسے تو صرف اس کے پیٹ میں پل رہے بچّے کی فکر تھی۔

سجاتا کو اس کی ساس قریب کے ایک گاؤں کے گنی بابا کے پاس لے گئی۔ وہاں پہلے سے ہی کئی عورتیں موجود تھیں۔

وہاں کی فضا صندل اور کافور کی خوشبو سے معطر تھی۔ لوبان کا دھواں بھی ہر طرف پھیل رہا تھا۔ دونوں ساس بہو بھی قطار میں بیٹھ گئی۔ سجاتا کا نمبر آنے پر اس کی ساس نے کہا۔

"بابا ای ہمری بہو پیٹ سے ہے۔ اس نے چندر گرہن کے بیچ آنگن میں آنے کا پریاس کیا۔ کہیں اس کا بچہ............"

"بس بس میں سمجھ گیا۔ تمہیں اور کچھ بتانے کی ضرورت نہیں ہے ماتے۔ اس کے گرہ کاٹنے ہونگے۔" کہتے ہوئے گنی بابا نے اپنے مور کے پنکھے سے جھاڑنا شروع کیا۔ اس نے کئی ٹوٹکے کیے اور گھر جا کر بھی ٹوٹکے کرنے کی ہدائیت دی۔ بھوکی پیاسی سجاتا گنی کے مور پنکھ کی مار سہتی رہی۔ اندر ہی اندر بلبلاتی رہی۔ لیکن اس کی وہاں کون سننے والا تھا۔ دن چڑھ آیا تھا لیکن اب تک اسے سوکھی روٹی بھی نصیب نہیں تھی۔ وہ ادھ مری سی ہوگئی تھی۔ گنی بابا نے جھاڑ پھونک کے بعد دکھشنا کے روپ میں اس کے پاؤں کی پائل کی مانگ کی۔ یہ بات سن کر سجاتا تو اندر سے کٹ کر رہ گئی۔ دو ہی تو زیور اس کے پاس تھے۔ ایک میکے سے ملا ناک کا پھول اور دوسری اس کے پتی کی سہاگ رات کو بھینٹ کی گئی پائل۔ وہ کسی بھی قیمت پر اپنے پتی کی دی ہوئی پائل اتار کر بابا کو دینا نہیں چاہتی تھی۔ لیکن ساس کی زبردستی نے اسے پائل اتارنے پر مجبور کر دیا۔ وہ پائل کے پیچ مروڑ کر کھول رہی تھی اس وقت اس کی آنکھوں سے جھر جھر آنسو گر رہے تھے۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اوپر والے نے اسے بیکار ہی پیدا کیا۔ مائکے میں بھی اس نے غربت وافلاس کی زندگی گذاری۔ سسرال آ کر بھی اسے دکھ دیکھنے کو ہی مل رہے تھے۔ اس نے من ہی من اس گنی بابا کو ہزاروں گالیاں دیں۔

بوجھل قدموں سے ہولے ہولے چلتی ہوئی وہ گھر آئی۔ گھر آ کر بھی اسے کئی ٹونے ٹوٹکوں سے گذرنا پڑا۔ تب جا کر اسے خود سے کھانا بنا کر کھانا پڑا۔ ان ناگفتہ بہ حالات سے تو وہ مر جانا بہتر سمجھتی تھی۔ اس وقت اس کے پیٹ میں کچھ ہلچل سی ہوئی۔ شاید بچے نے پاؤں پھینکے ہوں گے۔ سجاتا دھیرے سے اپنا پیٹ سہلا کر کھاٹ پر لیٹ گئی۔

چندر گرہن کے ٹھیک دس دنوں بعد سجاتا کو بیٹی پیدا ہوئی۔ لیکن گہن لگو، جس کا سجاتا کو ہر گھڑی ڈر ستا تا رہتا تھا۔ آخر وہی ہونی ہو کر رہی۔ شاید راہو اور کیتو کی طرح بھگوان نے اس سے بھی کسی جنم کا بدلا لیا تھا۔ بچی ایک دم بے ڈول، ہاتھ پاؤں ٹیڑھے میڑھے تھے۔ سجاتا کی ساس کی نظر جب اس نوزائدہ بچی پر پڑی تو وہ آگ بگولا ہوگئی۔ وہ چیخنے لگی۔

''رانڈ میں کہتی تھی نا کہ چندر گرہن کے سمے سنبھل کر رہ۔ لیکن تو نے تو کوئی پرواہ ہی نہیں کی۔ لے اپنے کئے کا پھل بھوگ۔'' غصّے میں لال پیلی سجاتا کی ساس نے صرف بچّی کو دیکھا اور غراتی ہوئی کمرے سے باہر چلی گئی۔ سارا کام دائی پر چھوڑ دیا۔

سجاتا پر ایک تو پہلے سے ہی خوف طاری تھا۔ دوسرے دردزہ سے نیم غشی کی حالت میں پڑی تھی۔ لیکن ساس کی دہاڑیں سن کر اسے جیسے ہوش آ گیا ہو۔ اس نے اپنی نیم وا آنکھوں سے اپنی بچّی کو دیکھا اور پھر سسکنے لگی

''بھگوان تیری بھی عجب لیلا ہے۔ کس جنم کا بدلا لیا بھگوان.........'' وہ زیر لب بڑبڑائی۔

دائی بچّی کو صاف ستھرا کر کے لوٹ گئی لیکن سجاتا نیم غشی کی حالت میں جانے کب تک پڑی رہی۔ بچّی بھی بھوک سے اپنی ٹیڑھی میڑھی انگلیاں چاٹ رہی تھی۔ بیچ بیچ میں وہ منحنی سی آواز میں روتی بھی۔ دھیرے دھیرے محلے کی عورتیں جمع ہونے لگیں۔ محلے کی عورتیں آتیں تو سجاتا کی ساس بول پڑتی۔ ''کمینی کو میں نے لاکھ سمجھایا لیکن اپنے من کا ہی کی۔ بڑی گیانی ہے نا۔ میرے گھر ہی کالک پوتنے آئی ہے۔'' محلے کی عورتیں بھی بچّی کو حیرت بھری نظروں سے دیکھ کر سرگوشیاں کرتی ہوئی گھر لوٹتیں۔

صبح سے شام تک میں سجاتا کو کچھ بھی کھانے پینے کو نہیں ملا۔ بھوک سے اس کا بُرا حال ہو رہا تھا۔ اس کی آنت میں اینٹھن ہو رہی تھی۔ اسے چارپائی سے اٹھا نہیں جا رہا تھا۔ تبھی اس کی ہمدرد بغل والی رکمنی دیدی گاؤں کے سیٹھ کے یہاں سے کام کر کے وہاں آئی۔ اس نے جلدی سے اپنے گھر کا کھانا لا کر کھلایا اور اس کی ڈھارس بندھائی۔ اس کے پیٹ کی آگ تو بجھ گئی مگر اس کا ذہن سیّارہ کی طرح گردش کر رہا تھا۔ اس وقت اسے اچھی غذا کی ضرورت تھی مگر روکھی پھیکی چیزوں پر ہی اکتفا کرنا پڑا۔ اس پر بھی اسے ساس کی جلی کٹی ہر گھڑی سننی پڑتی۔

سجاتا اپنی بچّی کو بغور دیکھتی جسے وہ نو ماہ تک اپنے پیٹ میں ڈھوئے پھری تھی۔ ہر لمحہ اس کے بارے میں سوچتی رہتی۔ وہ سوچتی بھگوان کے کھیل بھی کتنے نرالے ہیں۔ اگر اسے گبھن لگو بیٹا ہوا ہوتا تو اسے اتنی فکر نہیں ہوتی جتنی کہ بیٹی ہو کر ہوئی۔ اگر بیٹا ہوتا تو دکلانگ کوٹے میں نوکری

مل جاتی اور کوئی نہ کوئی اسے اپنی بیٹی سونپ دیتا مگر سجاتا کو تو بیٹی ہوئی تھی۔ اس جہیز زدہ سماج میں چاند کے ٹکرے کو بھی بیاہنے میں اچھا خاصا خرچ ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ تو ٹھہری گہن لگو۔ اس گوشت پوست کے لوتھڑے کو آخر کون بیاہ کر لے جائے گا۔ یہ تو ماں باپ کے ماتھے پر ہی رہے گی۔ سجاتا یہ سب سوچ سوچ کر پریشان ہو رہی تھی۔ وہ غنودگی کے عالم میں بھی یہی سب بڑبڑاتی رہتی۔

چار دن چار راتیں بیت گئیں لیکن سجاتا کو ایک وقت کا بھی اچھا کھانا نہیں ملا۔ وہی روکھا پھیکا۔ وہ دن بدن لاغر و نحیف ہوتی جا رہی تھی۔ اس پر بھی ساس کی لعن طعن سننی پڑتی۔ وہ اس اذیت ناک ماحول سے گھبرا اٹھی۔ تبھی ایک بات اس کے ذہن میں اچانک کوند گئی۔ اور اس نے مصمم ارادہ کر لیا کہ آج وہ اپنی ممتا کا خون کر دے گی۔ اس بچّی کا خون کر دے گی جس نے آج سے ٹھیک چار دن قبل اس عالم رنگ و بو میں آنکھیں کھولیں۔

آدھی رات کا وقت تھا۔ ہر طرف ہو کا عالم تھا۔ تبھی سجاتا نے اپنی بچّی کو گود میں اٹھایا۔ اسے والہانہ طور پر چوما، گلے سے لگایا۔ وہ کبھی بچی کو دیکھتی تو کبھی اپنے آپ کو۔ اسے اس وقت پوری دنیا بالکل سیاہ دکھ رہی تھی۔ اسے اپنے آپ پر بھی ترس آرہا تھا۔ وہ سوچتی رہی کہ جو وہ کر رہی ہے وہ درست ہے یا نہیں۔ دوسرے پل ہی اسے اپنی بچّی کا تاریک مستقبل دکھائی دیتا۔ ممتا کی لہر جب اس کے جسم میں اٹھتی تو وہ اسے جھٹک دیتی۔

اس نے فیصلہ کر لیا۔ اس کا پنجہ معصوم بچّی کی گردن پر جم سا گیا اور چند سکنڈ میں ہی بچّی کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں باہر کو آگئیں۔ ساتھ ہی سجاتا کی ممتا کو ایک بار پھر ابال آگیا۔ وہ پاگلوں کی طرح زور زور سے ولاپ کرنے لگی۔ اپنا سر نوچنے کھسوٹنے لگی۔

ایک بار پھر محلّے کی عورتیں اکٹھا ہوئیں۔ آپس میں سرگوشیاں کرنے لگیں۔ لیکن سجاتا کو ایک آواز سنائی نہیں دے رہی تھی جس سے وہ آشنا تھی۔ اس کی ساس بالکل خاموش تھی۔ اور سجاتا بھونچکی سی اردگرد کھڑی عورتوں کو تک رہی تھی۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح گرہن کے بعد چاند اپنے آس پاس کے ماحول کو دیکھتا ہے۔

☆☆☆☆☆

نروان

■ برسات کا موسم تھا۔ ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ جب اشوک کا انگوچھا پوری طرح بھیگ گیا تو وہ بھیڑ کے ریوڑ کو بدستور چرتے ہوئے چھوڑ کر سامنے والے ٹیلے پر چڑھ گیا جہاں بوڑھا مگر سرسبز گھنا پیپل سر نہوراے کھڑا تھا۔ وہ اسی کے نیچے دبک کر بیٹھ گیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک تیز دھار کھرپی تھی۔ اس نے ایک نظر اپنی بھیڑ کے ریوڑ پر دوڑائی اور پھر غیر ارادی طور پر اپنی کھرپی سے زمین کھودنے لگا۔

ابھی اس نے چند بالشت کنکر مٹی ہی ہٹائی تھی کہ اسے ایک بڑا سا سیاہ سر نما پتھر نظر آیا۔ اس کا اشتیاق بڑھا اور تابڑ توڑ کھرپی چلا کر اس نے پتھر کے منہ تک جالیا اور خوشی سے پاگل ہو گیا اور چلا چلا کر کہنے لگا۔

''بھگوان مل گئے...... بھگوان مل گئے!''

اس کی اس طرح کی آواز سن کر آس پاس کے گڑریے دوڑ پڑے۔ پھر کیا تھا آن کی آن میں یہ بات قرب و جوار کے گاؤں میں بھی جا پہنچی۔ اور پھر ایک جم غفیر اس ٹیلے پر کھڑا ہو گیا۔ سبھوں نے مل کر اس مورتی کے چاروں طرف سے کھودنا شروع کیا۔ آخر کار چند منٹ میں ہی ایک وشال مورتی اکھڑ کر سامنے آگئی۔ پنڈت دیا شنکر کی نظر جب مورتی پر پڑی تو اس جھٹ سے کہا۔

''یہ تو بھگوان شیو ہیں۔''

اسی سمے لوگوں نے ایک سبھا کا آیوجن کیا اور مندر کے نرمان کی تجویز پیش کی گئی۔ پنڈت دیا شنکر نے اپنے چھوٹے سے بھاشن میں سترہ سالہ اشوک کو بھگوان کا اوتار ثابت کرتے ہوئے کہا کہ بھگوان نے اشوک کے مادھیم سے ہی اپنے کو پرکٹ کیا ہے۔ اس لئے بھگوان کی مورتی کے

ساتھ ساتھ اشوک کی بھی سیوا کرنا ہم لوگوں کا دھرم ہوگا۔

بس کیا تھا لوگ پنیہ کمانے کے لیے دل کھول کر دان دینے لگے۔ کسی نے سیمنٹ دیا تو کسی نے بالو، کسی نے چھڑ دیا تو کسی نے اینٹیں۔ اور پھر مزدوروں نے بنا مزدوری کے ہی مندر کھڑا کرنے کی ٹھان لی۔ مہینے دن کے اندر ہی ٹیلے پر ایک خوبصورت سا مندر کھڑا ہو گیا۔ بھگوان شیو کی مورتی اسی مندر کے اندر استھاپت کر دی گئی۔ اور اشوک کو چندن ٹیکا لگا کر اور گیروے وستر پہنا کر مندر میں بٹھا دیا گیا۔ پوجا پاٹھ کا کام پنڈت دیاشنکر نے اپنے ذمہ لیا۔

چونکہ بھگوان کی مورتی کی کھوج اشوک نے کی تھی اس لیے ایک گیانی دھیانی نے اس مندر کو اشوک دھام سے منسوب کیا۔ اب اشوک دھام کی شہرت و مقبولیت گرد و نواح کے سارے گاؤں میں پھیل گئی۔ اور ٹھٹ کے ٹھٹ شردھالو اشوک دھام کے تیرتھ کرنے اور بھگوان کی پوجا ارچنا کرنے کے لئے آنے لگے۔ خاص طور سے سوموار کے دن تو اشوک دھام تیرتھ یاتریوں سے کھچا کھچ بھرا رہنے لگا۔ لوگ اپنی اپنی کامنائیں لے کر آتے اور مندر کی آمدنی سیدھی دوگنی ہوتی گئی۔ لیکن پنڈت دیاشنکر بڑی دیانت داری سے پیسے کا بٹوارہ کر لیتا۔ کل آمدنی کا آدھا بھاگ مندر کے خرچ کے لیے رکھتا اور آدھے پیسوں میں سے آدھا اشوک کو دیتا اور آدھا اپنے پاس رکھتا۔ پنڈت جی کی اس حسنِ سلوک پر لوگوں نے بھی کوئی روک ٹوک نہیں لگائی۔

تیرتھ یاتری بھگوان شیو کے چرنوں کے ساتھ ساتھ اشوک کے چرن بھی چھوتے۔ اور اشوک پنڈت جی کے بتائے ہوئے شبدوں سے انھیں آشیرواد دیتا۔ وہ آنکھیں میچے ایک ہاتھ اوپر اٹھا کر کہتا۔

”بھگوان تیرا کلیان کرے۔ تیری کامنائیں پوری ہوں۔“

اتنا سن کر عورتیں طرح طرح کے چڑھاوے چڑھاتیں۔ کوئی سونے کا کلش تو کوئی اپنے پُتر کے سر منڈن تو کوئی اپواس وغیرہ کی منتیں مانگتی۔

شام کا سمے تھا۔ مندر میں اکا دکا تیرتھ یاتری نظر آرہے تھے، لیکن اشوک بدستور اپنی آنکھیں مونڈے ساکشات بھگوان کا روپ دھارن کیے بیٹھا تھا۔ تبھی اس کے کانوں سے ایک

نسوانی آواز ٹکرائی، جس میں بلا کا ترنم اور درد تھا۔

''پربھو، میری نہیں سنو گے۔ میں کب سے جل رہی ہوں۔ یہ دیکھو جلے داغ۔ کس بے دردی سے میری سوتیلی ماں نے جلتی ہوئی کاٹھی سے مجھے مارا ہے۔''

پندرہ سولہ برس کی ایک کامنی سی، موہنی سی لڑکی نے اپنے گال کے جلے داغ پر اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''تو سب کی سنتا ہے بھگوان۔ میری بھی سن لے۔ مجھے اس نرک سے نکال پربھو نہیں تو میں گھٹ گھٹ کر پران تیاگ دوں گی۔''

اشوک سے اس سے زیادہ نہ سنا گیا۔ اس نے اپنی بند آنکھیں ترت کھول دیں۔ سامنے ہاتھ جوڑے آنکھیں موندے روپ متی کھڑی تھی۔ اسے وہ اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ پرتاپ بابو کی پہلی گھر والی کی بیٹی تھی، جس کو جنم دے کر ہی ماں سورگ سدھار گئی تھی۔ پھر پرتاپ بابو نے دوسرا بیاہ رچایا۔ پرتاپ بابو کی دوسری بیوی بڑی تنک مزاج تھی۔ اس کو روپ متی ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ جب تک روپ متی کی دادی ماں زندہ رہی اسے سینے سے لگا کر رکھا لیکن اس کے مرتے ہی روپ متی کی حالت اس گھر میں ایک نوکرانی سے بھی بدتر ہوگئی۔ اس کی سوتیلی ماں مار مار کر اس کا کچومر نکال دیتی۔ اور پرتاپ بابو اس کے خلاف ایک شبد نہیں بولتے۔ اور آج تو اس کی سوتیلی ماں نے اسے جلتی کاٹھی سے مارا تھا۔ اس کے گورے گورے کومل کپول کو داغدار ہی بنا ڈالا تھا۔ اب بھی اس سے ہلکا ہلکا پانی رس رہا تھا۔ اشوک کا دل روپ متی کے دکھ سے بھر آیا اور بے ساختہ اس کے منہ سے نکل پڑا۔

''کنیا، آج تیرا اکلیان ہو جائے گا۔ راتری کے ٹھیک بارہ بجے تو اپنے گھر سے نکل کر تھان کے پاس کھڑی رہنا۔ اسی سے تیرے سپنوں کا راج کمار آئے گا اور تجھے اپنے ساتھ لے جائے گا۔ بس اسی میں تیری بھلائی ہے۔ جا پرسن ہو جا۔''

اتنا سننا تھا کہ روپ متی نے اپنا تپ توڑ، ادھر ادھر دیکھ کر خوش خوش اپنے گھر کی راہ لی۔ بھگوان کی وانی سن کر روپ متی تو سراپا کھل اٹھی۔ اس نے اپنے سارے دکھوں کو بھلا ڈالا۔ اس کے

انگ انگ تھرک رہے تھے۔

دوسرے دن جنگل کی آگ کی طرح یہ خبر گشت کرنے لگی کہ اشوک دھام کے ساکشات بھگوان اشوک نے مکتی پالی۔ اسے نروان مل گیا۔ ٹھیک اسی دن قریب کے ایک گاؤں میں یہ بات بھی پھیل گئی کہ پرتاپ بابو کے پہلی گھر والی سے جو بیٹی روپ متی تھی وہ جانے کہاں گم ہوگئی۔

☆☆☆☆☆

کُتّا

■ امیرو اپنی خاندانی بندوق آؤٹ ہاؤس کے ایک کونے میں پٹکتا ہوا زیر لب بڑبڑایا۔

"ای سرکار بھی ہر تھے کانون بدلتی رہتی ہے۔"

امیرو دراصل خاندانی میر شکار تھا۔ اس کی ایک نالی بندوق اس کے جدامجد کی نشانی تھی۔ اس بندوق سے اس کے پرکھوں نے ہزاروں جنگلی؛ جانوروں کا شکار کیا تھا۔ آج بھی اس کے پشتینی مکان کی جھڑتی ہوئی دیواروں پر بارہ سنگھا اور نیل سانڈ کے سینگ سجے ہوئے ہیں۔ لیکن جب سے سرکار نے جنگلی جانوروں کے شکار پر روک لگادی تب سے اس بندوق کا استعمال نہیں کے برابر رہ گیا تھا۔ تاہم پرکھوں کی اس نشانی کو وہ اپنے سینے سے لگائے رہتا تھا۔

بیس سال کی عمر میں اس نے اس شہر میں قدم رکھا تھا اور کمپنی کے ایک آفیسر مسٹر نائر کے یہاں کتوں کی دیکھ بھال میں لگا دیا گیا تھا۔ وہ کمپنی کے ٹاؤن ڈویژن کا ایم.ڈی. تھا۔ اسے کتے پالنے کا بڑا شوق تھا۔ خاص کر اس کی بیوی کتوں کی پرورش پر پورا پورا دھیان دیتی تھی۔ ان کے کھانے پینے سے لے کر دوا دارو تک کا خیال رکھتی تھی۔ امیرو کو ہر وقت تاکید کرتی رہتی کہ وہ ان کا خاص خیال رکھے۔ شام کے وقت امیرو اور اس کی مالکن اپنے کتوں کو مختلف کرتب سکھاتے۔ مسز نائر شہر میں ہر دو برس پر لگنے والے Dog Show میں حصہ لیتی اور اپنے کتوں کے کرتب دکھا کر تمغے حاصل کرتی۔

ایک دن پارک کی طرف سے گزرتے ہوئے مسز نائر کی نظر ایک آوارہ کتیا اور اس کے پلّوں پر پڑی جو اس کے بدن پر اُچھل کود کر رہے تھے۔ ان پلوں میں ایک بہت ہی خوبصورت خوش رنگ اور تندرست پلاّ تھا۔ مسز نائر کو پہلی نظر میں ہی وہ پلاّ بھا گیا۔ اس نے فوراً امیرو کو حکم دیا کہ کسی بھی

صورت اسے اٹھا کر بنگلے میں لے آئے۔ دو گھنٹے کی تگ و دو کے بعد امیرو اس پلے کو اٹھا لے آیا۔

مسز نائر اسی دن سے اس پلّے کی آؤ بھگت خوب کرنے لگی۔ اس کو اینٹی ریبیز کا انجکشن دلایا اور اس کا نام ٹائیگر رکھ دیا۔ ٹائیگر تندرست تھا ہی اچھی غذا سے اور نکھر گیا۔ اس کی گردن پر کالی دھاری دیکھتے ہی بنتی تھی۔ دھیرے دھیرے ٹائیگر مسز نائر اور امیرو سے کافی مانوس ہو گیا۔ کوارٹر کے کسی بھی حصے میں کوئی پتا بھی کھڑکتا تو ٹائیگر اٹھ بیٹھتا اور بھوں...بھوں...کرنے لگتا۔ ہر قدم پر وہ وفاداری کا ثبوت دینے لگا۔

شہر میں آوارہ کتوں کی تعداد کافی بڑھ گئی تھی۔ جب راہ گیروں، کمپنی کے ورکروں، ان کے بچوں کو آوارہ کتے کاٹنے لگ، مارننگ واک پر نکلنے والے کمپنی کے آفیسروں اور ان کے پالتو کتوں پر بھونکنے لگے تو کمپنی کے ٹاؤن ڈویژن، جس پر شہر کی صاف صفائی اور منٹنس کا ذمہ تھا، کے سامنے ایک بڑا مسئلہ درپیش ہو گیا۔ فائل مسٹر نائر کے پاس آئی۔ وہ ضلع کلکٹر سے ملے۔ کلکٹر نے اس مسئلے کی اہمیت کو دیکھتے ہوئے آوارہ کتوں کو پکڑنے اور شہر سے باہر لے جا کر شوٹ کرنے کا تحریری حکم دے دیا۔

ٹاؤن ڈیویژن میں آوارہ کتوں کو پکڑ کر مارنے کے لیے ایک ٹیم بنائی گئی۔ لیکن اس ٹیم میں ایسا کوئی آدمی نہیں تھا جسے کتے پکڑنے اور مارنے کا تجربہ ہو۔ تبھی مسٹر نائر کو امیرو کی یاد آئی، جس کے پاس ایک نالی بندوق تھی۔ وہ خاندانی میر شکار بھی تھا۔ تندرست، گٹھیلا اور اچھی صحت کا مالک بھی تھا۔ فیصلہ کیا گیا کہ امیرو جتنے آوارہ کتوں کو موت کے گھاٹ اتارے گا اسی حساب سے اسے روپے دیے جائیں گے۔

امیرو کی آمدنی کا نیا ذریعہ نکل آیا۔ وہ ٹیم کے ساتھ اپنی مہم پر نکلتا۔ وہ کچھ اس طرح کی بولیاں بولتا کہ آوارہ کتے خود بخود اس کے ارد گرد جمع ہو جاتے اور دوسرے لوگ پھندے میں جکڑ کر ان کتوں کو گاڑی میں بھرتے اور شہر سے باہر سنسان ٹیلے پر لے جاتے جہاں باری باری سے امیرو ان کتوں کو اپنی ایک نالی بندوق کا نشانہ بناتا۔ ہر سال کتے پکڑنے اور مارنے کی مہم جب ختم ہو جاتی اور امیرو کو کچھ روپے ہاتھ آ جاتے تو وہ چھٹی لے کر اپنے آبائی گاؤں ضرور جاتا۔ گاؤں میں اس کی

اکلوتی بیٹی اور اس کا گھر جمائی رہتا تھا۔ امیرو جب اپنے گاؤں کے قریب پہنچتا تو گاؤں سے باہر تاڑ بنہ کے پاس تاش کھیل رہے لوگ آوازہ کستے۔

''دیکھو دیکھو کتا مارنے والا شکاری آ گیا۔'' اور سب کھلکھلا کر ہنس پڑتے۔

گاؤں کے اندر داخل ہوتا۔ اس کا کوئی میر شکار دوست ملتا تو بے ساختہ امیرو سے پوچھ بیٹھتا۔ ''اس بار کتنے کتوں کا شکار کیا۔''

امیرو گاؤں کے لوگوں کی ان باتوں کا برا نہیں مانتا بلکہ فخریہ انداز میں کہتا۔

''پچاس... ساٹھ... ستر۔''

اس درمیان ٹائیگر واقعی ٹائیگر بن گیا تھا۔ مسز نائرا سے اپنے بیڈروم میں ہی سلاتی تھی۔ ٹائیگر بھی اس سے کافی مانوس ہو گیا تھا۔

اس دن مسٹر اور مسز نائر کی شادی کی سالگرہ تھی۔ مسٹر نائر نے اپنے خاص دوستوں کو بھی مدعو کیا تھا۔ دعوت کی پوری تیاری ہو چکی تھی۔ کاک ٹیل پارٹی کا بھی انتظام تھا۔ لیکن اس دن اچانک آرڈر ملا کہ کمپنی کی لکھنؤ یونٹ میں ایسا ارجنٹ کام آن پڑا ہے جسے مسٹر نائر ہی ہینڈل کر سکتے تھے۔ مسٹر نائر کو طوعاً و کرہاً شام کو ہی کمپنی کی نجی فلائٹ سے جانا پڑا۔ مہمانوں کی خاطر داری کا ذمہ مسز نائر کے کاندھے پر آن پڑا۔

مسز نائر نے سب کی خوب خاطر داری کی۔ وہ خوبصورت تو تھی ہی، سلیقہ مند بھی تھی۔ دیر رات تک پارٹی چلتی رہی۔ اسکاچ، وہسکی اور شمپئن کا دور بھی چلا۔ بھی مہمان چلے گئے مگر نائر کے دو قریبی دوست رکے رہے۔ مسز نائر کو بھی ان دونوں نے وھسکی پلا دی۔ وہ اپنا توازن کھونے لگی۔ وہ دونوں مسز نائر کو بیڈروم میں لے گئے۔ ادھر ٹائیگر بھی بے سدھ پڑا تھا۔ اسے بھی کوئی نشہ آور چیز کھلا دی گئی تھی۔ جس کی وجہ سے ٹائیگر کی قوت مدافعت جیسے زائل ہو چکی تھی۔ رات کے پچھلے پہر دونوں مہمان چلے گئے۔

مسز نائر کی آنکھ کافی دیر سے کھلی۔ اب بھی اس کا پور پور ٹوٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ سر درد سے پھٹا جا رہا تھا۔ بستر سے اٹھی اور دوبارہ غنودگی کے عالم میں بستر پر پڑ گئی۔ سامنے ٹائیگر بھی مضمحل سا

کھڑا اپنی مالکن کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہا تھا۔ جیسے آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ کہنا چاہ رہا ہو۔ کچھ دیر بعد مسز نائر طاقت بٹور کر اٹھی اور ٹائیگر کو کان سے پکڑ کر باہر آؤٹ ہاؤس کی طرف لائی اور چیختے ہوئے بولی۔ ''امیرو، اسے ٹیلے پر لے جا کر شوٹ کر دو۔''

امیرو ہکا بکا سا کبھی مالکن کی طرف دیکھتا تو کبھی ٹائیگر کی طرف۔

ٹائیگر کی نگاہ زمین پر جمی تھی۔

☆☆☆☆☆

قاتل مسیحا

■ ''ٹاپ''! کتنا مختصر اور جامع لفظ ہے جس کے اندر بحرِ ذخار کی سی وسعت و گہرائی ہے۔ اگر کسی کے نام کے ساتھ یہ لفظ جڑ جائے تو پھر اس کے لئے یہ مژدہ جانفزا ہوگا۔ اور وہ نام اپنے اندر انفرادیت رکھے گا۔ لیکن نیلوفر کے لئے اب یہ لفظ اپنی معنوی تہہ داری کھو چکا ہے۔ وہ اپنی ڈگری پر لگے اس لفظ کو کھرچ کر مٹا دینا چاہتی تھی۔ ڈگری نے اس کے ذہن میں انتشار پیدا کر دیا اور نیلوفر اچانک ماضی کے تلخ تجربوں میں گم ہوگئی۔ خاص طور سے ایم اے کے ان دو سالوں میں اس نے کیا کھویا اور کیا پایا اسی کی نشاندہی کرنے لگی۔

نیلوفر ایم اے کی طالبہ تھی۔ بڑی شوخ و چنچل اور ذہین۔ اس کی طبعی اور علمی صلاحیت کو دیکھ کر بھی پروفیسر عش عش کر کے رہ جاتے۔ یہی نہیں خالقِ کائنات نے اسے حسن کی دولت سے بھی نوازا تھا۔ اس کے متناسب جسم اور تیکھے نقوش کو دیکھ کر کلاس کے لڑکے اور لڑکیاں تو کیا پروفیسروں کی بھی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جاتیں۔ سمندر کے نیلے پانی کی طرح اس کی نیلی نیلی سحر آگیں آنکھیں ہر کسی کو منٹوں میں مسحور کر لیتیں۔ چنانچہ ڈپارٹمنٹ کا ہر فرد اس کی ذکاوت اور خوبصورتی کا رسیا بن گیا تھا۔

لیکن ان سب باتوں سے ماورا نیلوفر نے حصولِ علم کے لئے اپنے کو وقف کر دیا تھا۔ ہر گھڑی تنقید و تحقیق کے کاموں میں منہمک رہتی۔ یہ الگ بات تھی کہ اس کی غیر معمولی ذہانت اور خوبصورتی سے سیکڑوں لڑکے گھائل ہو گئے تھے اور لڑکیاں تو جل بھن کر رہ گئی تھی۔ لیکن نیلوفر کو اب تک کوئی لڑکا گھائل نہیں کر سکا تھا۔

ہاں دو آنکھیں نیلوفر پر ہمیشہ مرکوز رہتیں جس کی تاب نہ لا کر نیلوفر بوکھلا جاتی اور اپنے خدو خال کا جائزہ لینے لگتی۔ ان دو آنکھوں کی چبھن نیلو کے اندر ایک ہیجان سا پیدا کر دیتی۔

وہ دو آنکھیں صدر شعبہ کی تھیں۔ پروفیسر رحمٰن صاحب کی۔ جس کی شفقت و مہربانی سے نیلو کو یونیورسٹی سے ایک چھوٹا سا وظیفہ مل رہا تھا اور اسی وظیفے سے نیلو اپنی پڑھائی کا سارا خرچ پورا کر رہی تھی۔ کھانا تو اسے چھوٹی خالہ امی کے یہاں مل ہی جاتا تھا۔ اگر خالہ امی نہ ہوتیں تو نیلو بی اے کے بعد پڑھ بھی نہ پاتی۔ لیکن بھلا ہو اس کی چھوٹی خالہ امی کا جنھوں نے اس کو ذہانت کی دیکھ کر اسے اپنے ساتھ شہر لے آئیں۔ اور ایم اے میں داخلہ کرا دیا۔ ہاں اس کے عوض میں اسے اپنے چھوٹے چھوٹے خالہ زاد بھائی بہن کو پڑھا دینا پڑتا تھا۔ جو کوئی مشکل کام نہ تھا۔

بس نیلو کو ایک ہی دھن تھی کہ وہ ایم اے میں ٹاپ کرے اور اسی کی تکمیل میں وہ دن رات عرق ریزی کرتی رہتی۔ لائبریری کو کھنگالتی رہتی۔ کبھی کبھی تو اس کی سہیلی اسے بک ورم سے موسوم کر دیتی۔ لیکن نیلوفر صرف مسکرا کر رہ جاتی۔

اسی تگ و دو میں امتحان کے دن آن پہنچے اور نیلو امتحان میں بڑی تندہی سے مصروف ہوگئی۔ اس کے سارے نوٹس اپنے تھے جسے اس نے بڑی دیدہ ریزی سے تیار کئے تھے۔ وہ بڑی پُر امید تھی کہ وہ اس بار ایم اے میں ٹاپ کرے گی۔

آخری پرچے کا امتحان دے کر نیلوفر جیوں ہی ہال سے باہر آئی تو سامنے آفس کا چپراسی رام دین کھڑا تھا۔

"نیلوفر آپ ہی کا نام ہے؟ صاحب نے بلایا ہے۔"

"کون؟ رحمٰن صاحب؟"

"جی......"

نیلوفر نے اپنے اندر ایک خلجان سا محسوس کیا اور غیر ارادی طور پر صدر کے چیمبر کی طرف بڑھ گئی۔ چیمبر میں ٹیبل پر کہنیاں ٹکائے رحمٰن صاحب اپنی نگاہیں دروازے پر ہی مرکوز کئے بیٹھے تھے جیسے انھیں کسی کا انتظار ہو۔

''آیئے......آیئے.....نیلوفر صاحبہ.....ٹیک یور سیٹ....'' نیلوفر اپنی جگہ پر کٹ کر رہ گئی۔ اسے سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ آج صدر شعبہ نے اسے اپنے برابر والی کرسی پر کیوں کر آفر کیا۔ چند لمحوں کے لئے نیلو رحمن صاحب کے چہرے کی لکیروں کو بغور پڑھتی رہی جس کی خندہ پیشانی میں جذباتیت کا دخل تھا۔ نیلو نے پس و پیش کی تو صدر نے دوبارہ کہا۔

''بیٹھ جایئے....ایم اے کی طالبہ ہو کر ہچکچاتی ہیں۔'' سہمی سہمی سی نیلوفر صدر شعبہ کے اصرار پر سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔

''کہیے پیپر سب کیسے رہے؟''

''ٹھیک ہی رہے سر.....''

''تو ٹاپ کرنے کا چانس ہے نا؟''

''سر...میں نے تو اپنی دانست میں پوری کوشش کی ہے۔ دیکھئے اللہ کیا کرتا ہے۔''

''لیکن نیلوفر صاحبہ، آپ جو یہ سمجھتی ہیں کہ آجکل اسٹوڈنٹ اپنی علمی صلاحیت کے بل بوتے پر ٹاپ کرتے ہیں تو یہ آپ کی غلط فہمی ہے۔''

''میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی سر۔'' نیلوفر نے قدرے متعجب ہو کر کہا۔

''مطلب تو واضح ہے نیلوفر صاحبہ....آجکل پیروی اور پیسے کا زمانہ ہے.....ہر جگہ پیسے کا کھیل ہے۔ اور.....''

''لیکن سر، پیروی کے لئے پیسے کہاں سے لاؤں گی۔'' نیلوفر کے ٹاپ ہونے کے خواب ریت کے گھروندوں کی طرح ڈھہتے ہوئے محسوس ہوئے۔

''تو کیا ہوا؟ بغیر پیسے کی بھی پیروی ہوتی ہے۔''

''مگر سر میں لڑکی ذات کہاں جاؤں گی؟''

''گھبراؤ نہیں، تمھاری پیروی میں کروں گا۔ تمھیں اچھا سے اچھا نمبر دلانے کی کوشش میں کروں گا۔ دس دنوں کے بعد میں آل انڈیا ٹور پر نکلوں گا۔ تمھارا بھی کام کراتا آؤں گا۔ اور تم بس.......''

''بڑی مہربانی ہوگی سر ورنہ میرے خواب تو ادھورے ہی رہ جائیں گے۔''

''اب تم جا سکتی ہو نیلوفر۔ میں خود ہی تمھاری آنٹی کے ہاں تم سے ملنے چلا آؤں گا۔''

نیلوفر چیمبر سے نکلی اور سیدھے گھر کی راہ لی۔ اس کے سارے وجود پر ٹاپ کرنے کی سرشاری و بے خودی چھائی ہوئی تھی اور اس کے کانوں میں ''ٹاپ'' رس گھول رہا تھا۔ گھر آ کر اس نے اپنی آنٹی سے بھی ساری بات بتا دی۔ وہ بھی سن کر بہت خوش ہوئیں۔

ایک مہینہ کچھ روز گزر گئے۔ لیکن نیلوفر اب تک اپنے گھر نہیں گئی تھی۔ وہ صدر کے ٹور سے لوٹنے کی منتظر تھی۔ تبھی اچانک ایک دن صدر اس کی آنٹی کے ہاں آ دھمکے۔

نیلوفر تو صدر صاحب کو دیکھ کر خوشی سے پھولے نہ سما رہی تھی۔ اس نے فوراً اپنے خالہ زاد بھائی کو بازار سے ناشتہ کے لئے بھیجا اور خود کچن میں چائے بنانے لگی۔ یہی حال نیلوفر کی آنٹی کا تھا۔ وہ بھی بڑی خوش تھیں۔ پھر چند منٹوں میں ہی ساری میز ناشتے سے بھری تھی۔

''تمھارا کام تو قریب قریب ہو ہی گیا نیلوفر۔'' صدر نے رس ملائی کی طشتری سے ایک پیس اٹھاتے ہوئے کہا۔

''سر آپ نے کتنی پریشانیاں اٹھائی ہوں گی میرے لئے۔''

''نہیں پگلی، تم جیسی لڑکی کے لئے تو اور بھی کچھ کرنا چاہئے۔''

''سر آپ مسیحا ہیں ورنہ ہم جیسی غریب لڑکی کے لئے کون اتنا سارا کچھ کرتا ہے۔''

''بس کرو نیلو تم نے مجھے مسیحا کہا اور نہ جانے کیا کیا کہو گی۔ ہاں کل تم میرے کاٹیج دوپہر ساڑھے بارہ بجے کے قریب آنا اور نمبر نوٹ کر لینا۔'' رحمٰن صاحب نے کیک کو منھ میں دباتے ہوئے کہا۔

صدر شعبہ تو چلے گئے۔ لیکن نیلو کو تو جیسے جہان بھر کی خوشیاں دے کر گئے ہوں۔ وہ تھی تو اپنی آنٹی کے چھوٹے سے مکان میں لیکن اس کا ذہن سیارہ کی طرح آسمان کی بلندی پر گردش کر رہا تھا۔

دوسرے دن ٹھیک بارہ بجے نیلوفر نے ہلکا سا میک اپ کیا اور رکشا سے رحمٰن صاحب کے کاٹیج پر جا پہنچی۔ خلاف معمول کاٹیج کا دروازہ کھلا تھا۔ اندر ہال میں ٹیبل سے ٹیک لگائے ایک

ہاتھ میں خالی گلاس لئے رحمٰن صاحب دروازے کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہے تھے۔ نیلوفر پر نظر پڑتے ہی وہ تیزی سے دروازے کی طرف لپکے اور بڑے پرتپاک لہجے میں کہا۔ ''آؤ... آؤ نیلوفر۔ میں کب سے تمھارا انتظار کر رہا تھا۔'' اتنا کہہ کر اس نے دروازے کی کنڈی چڑھا دی۔

نیلوفر اندر جا کر کرسی پر بیٹھ گئی۔ لیکن اس کی آنکھیں اب بھی صدر کی خمار آلود آنکھوں پر مرکوز تھیں، جس میں گویا سیکڑوں بوتل کا نشہ بیک وقت موجزن تھا۔ نیلوفر اپنی جگہ سہم کر رہ گئی۔ وہ بالکل گم صم صدر کے تنے ہوئے چہرے کو گھور رہی تھی۔ تبھی صدر اس کی کرسی کے قریب آ پہنچا اور سے بازوؤں سے پکڑ کر اٹھاتے ہوئے کہا۔

''اب تم ٹاپ کر جاؤ گی نیلوفر۔ آؤ میری باہوں میں سما جاؤ۔''

''لیکن سر!....'' نیلوفر نے صدر کو اپنے سے الگ کرنا چاہا لیکن صدر نے باز کی طرح اسے اپنے بازوؤں کے حصار میں لے لیا۔

''نیلو کچھ پانے کے لئے کچھ کھونا بھی پڑتا ہے۔ بس ایک بار نیلو صرف ایک بار....''

نیلو کے بدن میں لفظ ''ٹاپ'' کی چنگاری اٹھی اور سارے بدن کو اندر ہی اندر جھلسا گئی۔ وہ چلاّنا چاہتی تھی لیکن وہ جانتی تھی چلانے سے کیا ملے گا۔ صرف بدنامی... نامرادی... مایوسی۔

اور پھر وہی ہوا جو ہونا تھا۔ نیلوفر کو امتیازی نمبر مل گئے۔ ٹاپ کی ڈگری بھی مل گئی۔ لیکن اس کے اندر جو خلش و کرب اور بے چینی ہلکورے کھا رہی تھی وہ بدستور قایم رہی۔

''ارے او نیلی نیلی آنکھوں والی نیلوفر! کیا سوچنے لگی۔ بابل کے گھر سے جانے کی سوچنے لگی۔ ارے پہلے مٹھائی تو کھلا۔ تو نے بازی مار لی۔'' نیلوفر کی ایک کلاس فیلو نے اسے جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔

''کیسی بازی......'' نیلو چونک کر اپنی سہیلی کی طرف مخاطب ہوئی۔ جیسے وہ کسی خواب پریشاں سے بیدار ہوئی ہو۔

☆☆☆☆☆

روح کا سفر

■ میرے جسم سے روح نکال لی گئی۔

بڑی بے دردی سے، بڑی بے رحمی سے، ایذائیں پہنچا کر۔ میری بیوی، میرے دو کڑیل جوان بیٹے، دوست احباب، نوکر چاکر کوئی کچھ نہ کر سکا۔ حتیٰ کہ میری کمائی ہوئی جائز اور ناجائز دولت نے بھی میرا ساتھ نہ دیا۔ سب کے سب بیکار ثابت ہوئے۔ ہاں سارے محلے والے میرے گھر میں جمع ہو گئے تھے۔ دور دراز سے بھی رشتہ داروں اور جان پہچان والوں کی آمد جاری تھی۔ ہر شخص میری خوبیوں کو گنا رہا تھا۔ لوگ کہہ رہے تھے کہ خدا مرحوم کو جنت نصیب کرے۔ ان کی باتیں سن سن کر مجھے اپنے سارے کالے کرتوت ایک ایک کر کے یاد آ رہے تھے۔ حصول دولت کی خاطر میں نے کیا کیا نہیں کیا تھا۔ کتنے غریبوں اور بے کسوں کا خون چوسا تھا' کتنی بیواؤں اور یتیم بچوں کی زمینیں ہڑپ کی تھیں۔ مجبوروں' لاچاروں' بے بسوں اور بے کسوں پر کتنی زیادتیاں کی تھیں۔ مگر میرے مرنے کے بعد لوگ میری بد اعمالیوں کو بھول گئے تھے اور میرے لئے نیک کلمات کا اظہار کر رہے تھے۔ ہر شخص اتنی بات ضرور جانتا ہے کہ مرنے والے کی برائیاں بیان نہیں کی جاتیں۔

پھر غسال آئے۔ انہوں نے مجھے نہلا دھلا کر کورے سفید لٹھے میں لپیٹ دیا۔ میری داغدار زندگی سے یہ بے داغ کپڑا کسی طرح میل نہیں کھا رہا تھا۔ کفنانے کے بعد میری نعش کو آہستگی کے ساتھ اُٹھایا گیا اور اور پھر کھاٹ پر لٹا کر گھر سے باہر نکالا گیا، میرے دونوں بیٹوں کو میری موت کا مطلق قلق نہ تھا۔ ان کے چہرے ہر قسم کے جذبات سے عاری تھے۔ البتہ میری بیوی کھاٹ کے پائے سے لپٹ کر زار و قطار روئے جا رہی تھی مگر اب اس سے کیا حاصل.....؟

بیوی کی یہ حالت دیکھ کر میرا مردہ جسم بھی کانپ اُٹھا لیکن دونوں بیٹوں کی بے مروتی اور بے اعتنائی دیکھ کر مجھے کوفت سی ہونے لگی۔ میرا جنازہ مسجد کے صحن میں رکھا ہوا تھا۔ نماز جنازہ میں بیشمار لوگ شریک تھے۔ اتنی بڑی بھیڑ دیکھ کر مجھے یک گونہ سکون محسوس ہوا۔ میرا شمار علاقے کے معزز ترین لوگوں میں ہوتا تھا۔

نماز جنازہ کے بعد میں چار کاندھوں پر سوار ہو کر قبرستان کی جانب چلا۔ نئی کھدی ہوئی قبر میری منتظر تھی۔ پہلے اسے عرق گلاب سے معطر کیا گیا۔ اس کے بعد سرہانے میرا شجرہ رکھا گیا اور پھر آہستہ آہستہ مجھے قبر کی گہرائیوں میں اُتار دیا گیا۔ شیشم کی لکڑی اور تاڑ کے پتّوں سے قبر پاٹ دی گئی۔۔ اس کے بعد لوگوں نے اس پر مٹی ڈالنی شروع کی۔ گورکن نے ابھی قبر کو پوری طرح درست بھی نہ کیا تھا کہ میرا بڑا لڑکا تیز قدموں سے گھر کی جانب روانہ ہو گیا۔ چھوٹے بھائی کی نظر جب بڑے بھائی پر پڑی تو وہ بھی تیزی کے ساتھ بڑھا۔ فاتحہ نہ درود.....دونوں گھر کی جانب لپکے چلے جا رہے تھے۔ لوگ متحیر تھے کہ آخر کیا بات ہو گئی۔ چند ایک نے انہیں روکنا بھی چاہا اور یوں گھر بھاگنے کی وجہ بھی دریافت کی مگر دونوں نے تہذیب و شرافت کو بالائے طاق رکھ دیا تھا۔ انہوں نے نہ کسی کی بات سنی نہ کسی کی بات کا کوئی جواب دیا۔

گھر پہنچ کر بڑے بیٹے نے سرعت کے ساتھ میرے بستر کے سرہانے کو ٹٹولا۔ اس سرہانے کے نیچے کچھ نقدی اور بینک کا پاس بک تھا۔ اس نے وہ دونوں چیزیں اپنے قبضہ میں کیں۔ چھوٹے بھائی نے بڑے بھائی کو یہ سب نکالتے دیکھ لیا۔ اس نے اپنا حصّہ مانگنا شروع کیا مگر بڑے نے کچھ بھی دینے سے انکار کر دیا۔ بڑے کے انکار سے چھوٹے کو غصہ آ گیا۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ' جھٹ سے میری دونالی بندوق نکال لی اور گولی بھری بندوق بڑے کے سینے سے لگا دی۔ مگر اس نے جیوں ہی ٹریگر دبانا چاہا میں اُٹھ بیٹھا۔ آفتاب کی تیز روشنی چہار سو پھیلی ہوئی تھی۔ سامنے ٹرے میں چائے لئے میری بیوی مخصوص انداز میں مسکرا رہی تھی۔ چند ثانیوں تک تو میں حواس باختہ اسے گھورتا رہا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ میں نے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا تھا۔

☆☆☆☆☆

ہوئے تم دوست جس کے.......

"کشٹ ہرنی گھاٹ چلئے نہ گھومنے کے لئے۔ سنا ہے بڑا رومان پرور ماحول ہے وہاں کا..." میری نو بیاہتا پتنی رتی نے جب کشٹ ہرنی گھاٹ جانے کی پیشکش کی تو مجھے یوں لگا کہ کسی نے میرے لاشعور کے استھر تالاب میں ایک بڑا سا پتھر پھینک ڈالا ہو۔ اور اچانک میرے اندر کا انسان مجھے لعنت ملامت کرنے لگا۔ میں نے اپنے اندر ایک خلجان سا محسوس کیا۔

"اچھا کسی دن....." میں نے ٹالنے کے سے انداز میں کہا۔

"نہیں، آج ہی چلئے نا.....دیکھئے نا آج موسم بھی کتنا خوشگوار ہے۔" رتی نے میرے شرٹ کا کالر ٹھیک کرتے ہوئے کہا۔

اب میں رتی کو کیسے سمجھاؤں کہ مجھے کشٹ ہرنی گھاٹ جانے سے وحشت سی ہوتی ہے۔ ایک انجانا خوف میرے رگ وپے میں سرایت کر جاتا ہے۔ مجھ پر اضطراری کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ لگ بھگ پانچ سال بیت گئے وہاں کی سیر کئے ہوئے۔

"کیا سوچنے لگے.....؟" رتی نے چٹکی بجاتے ہوئے ہنس کر کہا۔

"آں..... ہاں چلو....." غیر شعوری طور پر میرے منھ سے لفظ 'چلو' نکل پڑا۔

اور با دل ناخواستہ میں نے اسکوٹر اسٹارٹ کیا اور رتی کو ساتھ بٹھا کر کشٹ ہرنی گھاٹ کی طرف چل پڑا۔

گھاٹ تک پہنچتے پہنچتے سورج ماند پڑ چکا تھا۔ اور یرقان زدہ گولے کی مانند افق مغرب پر براجمان تھا۔ لیکن لوگوں کی بھیڑ میں کوئی کمی نہیں تھی۔ بدستور لوگ کشٹ ہرنی گھاٹ کی پختہ سیڑھیوں پر بیٹھ کر مونگ پھلیاں پھوڑ پھوڑ کو کھا رہے تھے۔ دریا میں طغیانی آئی ہوئی تھی۔ پانی کی منھ زور

لہریں منہ پھاڑے اژدہے کی طرح بھنور بناتی ہوئی رواں دواں تھیں۔

میں نے اسکوٹر بند کیا اور رتی کو ساتھ لے کر بوجھل قدموں سے گھاٹ کی جانب بڑھنے لگا۔ اسوقت میرا ایک ایک قدم من من بھر سے کم نہیں لگ رہا تھا۔

جوں ہی گھاٹ کی پہلی سیڑھی پر میں نے قدم رکھا خوف کی ایک تیز لہر مجھے چھوگئی۔ میرا سارا جسم جھنجھنا اٹھا۔ مجھ پر جھلاہٹ طاری ہوگئی۔

''رتی.... رتی میں نیچے نہیں جاؤں گا۔ وہ.... دیکھو ان سرکش لہروں کو۔ اس سے بنے بھنوروں کو.... مجھے بڑا ڈر لگ رہا ہے.... شاید کہیں مجھے کوئی.....'' مجھ پر ہیجانی کیفیت طاری ہوگئی۔ اور رتی کو زبردستی کھینچتا ہوا میں واپس اسکوٹر تک چلا آیا۔

''یہ آپ کو کیا ہوگیا ہے؟ ایکدم نادان بچے کی طرح کر رہے ہو۔'' رتی نے تحیّر آمیز لہجے میں کہا۔

''ہاں رتی میرا احساس جرم مجھے نادان بچے سے بھی بدتر بنادیا ہے۔ چلو گھر چلو رتی ورنہ مجھے کچھ ہو جائے گا۔'' میں اب بھی کانپ رہا تھا۔ پھر بھی اپنی تمام تر طاقت کو یکجا کر کے میں نے اسکوٹر اسٹارٹ کیا اور گھر کی جانب چل پڑا۔

گھر پہنچ کر میں بستر پر آدھنسا۔ میرا پورا بدن تپ رہا تھا۔ سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔ اور سرہانے میں بیٹھی سہمی سہمی سی متذبذب رتی پوچھ رہی تھی۔

''یہ اچانک آپ کو کیا ہوگیا ہے؟ مجھے بھی تو بتائیے نا..... آخر میں آپ کی بیوی ہوں۔''

''ہاں رتی تم تو میری جیون ساتھی ہو۔ تمھیں نہیں بتاؤں گا تو اور کسے بتاؤں گا۔ رتی میں ایک قاتل ہوں۔ میں نے دو زندگیوں کو برباد کیا ہے رتی..... کیلاش..... آہ...... کیلاش میرا کلاس فیلو تھا۔ ہم دونوں دو جسم مگر ایک جان تھے۔ جو بھی کام کرتے ایک ساتھ۔ لیکن ہم دونوں کی دوستی کے بیچ وِدّیا چپکے چپکے سے آدھمکی اور ہم دونوں کے بیچ شگاف پیدا کرنے لگی۔..... وِدّیا کالج کی جان اور ہمارے کلاس کی روح تھی۔ ہر کوئی اس کی خوبصورتی کا رسیا تھا۔ اس کے ایک اشارے پر جان تک قربان کرنے کو تیار رہتا۔ وِدّیا کو اپنانے کے لئے ہر لڑکا طرح طرح کے کرشمے دکھاتا۔ میں نے بھی

وڈیا کو اپنانے کے لئے ڈورے ڈالنے شروع کئے۔ لیکن وڈیا تو اپنے من مندر میں صرف ایک ہی مورتی سمائی تھی اور وہ مورتی کیلاش کی تھی......وڈیا انتر آتما سے اس کی پوجا کرتی، اس پر محبت کے میٹھے میٹھے پرساد چڑھاتی۔ دھیرے دھیرے کیلاش بھی اس کی طرف کھنچتا چلا گیا۔ بہت جلد دونوں کی محبت کی کہانی زبان زد عام ہوگئی۔ یہ بات مجھے کھلنے لگی۔ میرے اندر خود غرضی کی لہر دوڑ گئی۔ دونوں کی بے پناہ محبت کو دیکھ کر میرے سینے پر سانپ لوٹنے لگا۔ آہستہ آہستہ میں کیلاش سے کھنچا کھنچا سا رہنے لگا۔ لیکن کیلاش تھا کہ اپنی دوستی کا دم بھرتا ہی رہا۔''

''ساون بھادوں کی ایک سہانی شام تھی۔ دریا امڈا جا رہا تھا۔ پانی کی سرکش لہریں منھ پھاڑے ہوئے خوفناک درندے کی طرح بھنور بناتی ہوئی گزر رہی تھیں۔ کشٹ ہرنی گھاٹ کی نچلی سیڑھی پر بیٹھا میں چھوٹی چھوٹی کنکریاں پانی میں اچھال رہا تھا۔ کنکری پانی میں آتی اور بھنور اسے اپنے اندر جذب کر لیتا۔ لیکن ان سب باتوں سے پرے میں کسی خیال میں گم تھا۔ اور وہ خیال تھا وڈیا اور کیلاش کی محبت کا۔ ان دونوں کی محبت میرے دل میں خار مغیلاں کی طرح کھٹک رہی تھی۔ تبھی عقب میں کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ مڑ کر دیکھا تو تیزی سے کیلاش سیڑھیاں اترتا ہوا میرے نزدیک چلا آرہا تھا۔ میں تو اسے دیکھ کر ایکدم سے جل بھن کر رہ گیا۔ لیکن اس نے آتے ہی مجھ پر خفگی جتاتے ہوئے کہا۔''

''کیوں یار آج تو نے مجھے نہیں بلایا؟''

''لیکن میں نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اس وقت میرا سارا وجود دہک رہا تھا۔ کیلاش میرے بغل میں آکر بیٹھ گیا اور چہک چہک کر وڈیا کی دوستی کے بارے میں بتانے لگا۔ اس کی باتیں سن کر میرے اندر بھونچال آگیا۔ جیسے کیلاش نے میرے جلے دل پر نمک چھڑک دیا ہو۔ پھر بھی میں اپنی نظریں ان لہروں کی طرف مرکوز کئے ہوئے تھا جو کسی وحشی درندے کی طرح منھ پھاڑے پاس سے گزر رہی تھیں۔''

''شام کے سائے گہرے ہوتے جا رہے تھے۔ کشٹ ہرنی گھاٹ کی سیڑھیوں پر ہم دونوں کے سوائے کوئی تیسرا نہیں تھا۔ میں اٹھ کھڑا ہوا۔ میرے ساتھ کیلاش بھی کھڑا ہو گیا۔ لیکن اس

نے مجھے روکتے ہوئے کہا۔''ارے یار رکو، میں اپنے پاؤں دھولوں۔''

''اور غیر ارادی طور پر میں رک گیا۔ کیلاش اپنی محبت کی کہانی میں مگن کھڑا گنگا جل سے اپنے پاؤں پکھار رہا تھا۔ تبھی میرے اندر دشمنی کی تیکھی بھاؤنا جاگ اٹھی اور میں نے جھٹکے سے کیلاش کو متلاطم دریا میں دھکیل دیا۔''

''پانی کی منھ زور لہریں اسے اپنی آغوش میں لے کر آگے بڑھ گئی۔ اسے تیرنا نہیں آتا تھا اور پانی کا بہاؤ بڑا تیز تھا۔ دو ایک بار لہروں کے ساتھ اٹھا اور پھر اندر دبا تو جانے کہاں گم ہو گیا۔ میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے گم ہوتے ہوئے دیکھتا رہا۔ مجھے کیلاش کے مرجانے کا غم تو ہوا۔ لیکن اس سے کہیں زیادہ مسرت ہو رہی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ اب وڈیا تو صرف اور صرف میری ہوگی۔''

''اسی وقت میں نے کیلاش کے گھر میں اس کے ڈوبنے کی خبر پہنچا دی۔ کیلاش کے گھر والے زار و قطار رونے لگے۔ وقتی ابال نے چند لمحوں کے لئے مجھے بھی غمزدہ کر دیا۔ چونکہ کیلاش کے گھر والے مجھے کیلاش سے کم نہیں سمجھتے تھے اس لئے ان لوگوں کا مجھ پر کوئی شک نہیں ہوا اور میں کیلاش کی ماں کو چند تسلی آمیز جملے کہہ کر گھر لوٹ آیا۔''

''دوسرے دن میں اندر ہی اندر خوش تھا۔ تبھی کسی نے بتایا کہ کیلاش کے ڈوب جانے کی خبر جب وڈیا کو ملی تو وہ یہ خبر سنتے ہی گر پڑی اور گری تو پھر اٹھ نہ سکی۔''

''ہاں رتی میں ان دونوں کا قاتل ہوں۔ آج جب تم نے کشٹ ہرنی گھاٹ کی بات چھیڑ دی تو میرا گناہ مجھے کچوکے لگانے لگا۔ آئندہ کشٹ ہرنی گھاٹ کا نام نہ لینا ورنہ.........''

☆☆☆☆☆
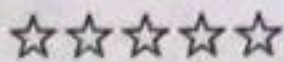
اِن کی نظر میں

نیاز اختر ایک اچھے افسانہ نگار ہیں ۔ ان کے افسانے میں عصری زندگی کے خارجی اور داخلی دونوں پہلوؤں کی عکاسی ملتی ہے۔ ان کا افسانہ 'گدھ'، رِستی تپتی زندگی اور بوڑھے برگد کا انت' کافی اپیل کرتے ہیں۔

ارشد حسن

نیاز اختر جس محکمے میں ہیں وہاں شہر اور بیرون شہر کی چھوٹی بڑی خبریں اُن تک پہنچتی رہتی ہیں۔ ان ہی خبروں میں سے کوئی خبر ایک افسانہ نگار کے دل میں بھنور بھی ڈال دیتی ہے ۔ نیاز اختر بظاہر کسی معمولی اور غیر اہم واقعہ یا سانحہ کو موضوع بنا کر افسانہ بیان کرنے کے فن سے واقف ہیں۔

اسلم بدر

ماہنامہ ـــ'' آجکل '' کے ماہ فروری ۲۰۱۲ء کے شمارے میں نیاز اختر کا افسانہ '' گدھ '' بے حد پسند آیا۔

ایم کاویانی

'آجکل' کے ماہ فروری ۲۰۱۲ کے شمارے میں 'نیاز اختر' کا افسانہ" گدھ " کافی پسند آیا۔ افسانے کی فضا بندی اور مکالمہ نگاری خاص طور سے پر لائق تحسین ہے۔

اقبال حسن آزاد

نیاز اختر تقریبا پچیس برسوں سے افسانہ نگاری کر رہے ہیں۔ ان کے افسانوں کے مطالعہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ افسانے کی تمام تر باریکیوں سے بخوبی واقفیت رکھتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں ہمارے ارد گرد بکھرے ہوئے واقعات، حادثات و مسائل ہی موضوع بنتے ہیں۔

آپکے افسانے " گدھ، رنتھی، ٹرمینیٹر، تپتی زندگی، بوڑھے برگد کا انت اور گرہن چند ایسے افسانے ہیں جو ان ہی تمام تر خوبیوں سے لیس ہیں۔ ان کے افسانے اپنے اندر زندہ رہنے کی بھرپور قوت رکھتے ہیں۔ افسانے زیادہ تہہ دار ہونے کے باوجود اپنے اندر بڑی جاذبیت رکھتے ہیں۔یہ اپنے افسانوں میں کہانی پن پر زیادہ focuss کرتے ہیں۔

معاشرے میں رونما ہونے والے سنگین حالات و واقعات کو بڑے فکر انگیز انداز میں پیش کرتے ہیں۔ ان کے یہاں کردار پلاسٹک کے بے جان پتلے نہیں بلکہ وہ ہماری طرح جیتے جاگتے سانس لیتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔

نیاز مہا بیانیہ، مؤثر بیانیہ اس طرح کے لغو معاملات میں نہیں الجھتے۔ ان کے افسانوں میں موجود بیانیہ انہیں افسانے کی حد میں رکھتا ہے۔ انہیں مضمون نہیں بننے دیتا ہے۔ وہ اپنے افسانوں میں ایسے مسائل سے آنکھیں چار کراتے ہیں جو اچھے اچھوں کی نگاہوں سے اوجھل ہوتے ہیں۔ان کے افسانوں کا مخصوص انداز رفتہ رفتہ ان میں تہہ

داری اور حقیقت نگاری برتنے کا سلیقہ پیدا کر دیگا۔

مجھے کہنے دیجئے کہ کبھی کبھی انسان کا جنون اس کی تڑپ اسے وہ مقام عطا کر دیتی ہے جس کا تصور وہ خواب میں بھی نہیں کرتا۔ نیاز کی تحریر میں یہ کیفیت پورے طور پر نظر آتی ہے۔ ان کا جنون اسے ایک دن اہم افسانہ نگاروں کی صف میں لا کھڑا کریگا۔ میں اس دن کا منتظر ہوں۔

انور امام

نیاز اختر کی کہانی "رتنھی" میں نے پڑھی۔ کہانی نہایت عمدہ اور اختتام چونکانے والا ہے۔ آج کے ہیلتھ ڈپارٹمنٹ کی بے راہ روی کی قلعی کھولتی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ کہانی کار کہانی کے ہر موڑ پر کھڑا ہے۔ اور اپنے تخلیقی کیمرے سے تصویر کشی کر رہا ہے۔

بشریٰ

آپکا افسانہ" گدھ " پڑھا۔ گدھ زرتشت اور پارسی کو موضوع بنا کر آپ نے ایک اچھا افسانہ لکھا ہے.......... آپ کا افسانہ اپنے آپ میں ایک اچھا اختتام رکھتا ہے۔ اس میں مسئلہ کی شدّت کے ساتھ اخلاقی پہلو بھی ہے۔ گِدھ کا جھنڈ بھی انسانی جذبوں سے ہم کنار ہے کہ وہ ایک نوجوان کی لاش کو چھونے سے احتیاط برت رہا ہے۔ آپ کو یہ تجربہ ہو گا کہ ہندؤں میں بالکل جوان کی موت کے شرادھ میں شرادھ کا بھوج لوگوں سے کھایا نہیں جاتا ہے۔ وہی حال آپ کے افسانے کے اختتام پر گدھوں کا ہوتا ہے کہ وہ بھوج کے بجائے سوگ منانے لگ جاتے ہیں۔ بہر حال اس کامیاب افسانے کے لئے مبارک باد قبول فرمائیں۔

پروفیسر شبیر حسن

نیاز اختر کے افسانوں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے معاشرے کا مطالعہ بڑی سچائی اور مشاہدہ بہت گہرائی سے کر دکھا ہے۔

تنویر اختر رومانی

خوبصورت پلاٹ بہترین تکنیک، سلجھا سلجھا انداز بیان، کہیں پر تصنّع کا شائبہ تک نہیں اور جناب افسانوں کا کلائمیکس جیسے خوشگوار کھلی ہوئی دھوپ میں بارش ہونے لگے۔ اور آپ اچانک گرنے والے قطروں سے بچنے کے لئے چھتری کھولنے کو مجبور ہو جائیں۔ جیسے مسکراتی ہوئی مونا لیزا کے ہونٹوں سے مسکراہٹ دھیرے دھیرے معدوم ہو جائے اور اس کی پیشانی پر تفکُرات کی لکیریں اُبھر جائیں۔ اردو فکشن کے ایک سنجیدہ قاری کو اور کیا چاہئے؟ بشارت ہو اردو کے نثری ادب کو کہ جھارکھنڈ کی سرزمین سے اختر آزاد کے بعد نیاز اختر کی شکل میں دوسرا ہیرا ملا ہے۔

ڈاکٹر آفاق اختر

نیاز اختر کی کہانیوں میں مقصد صاف طور پر جھلکتا ہے۔یہی کہانی کی اصل جان ہوتی ہے۔ ماحول کی آلودگی پر لکھی گئی ایک بہترین کہانی 'گدھ' واٹر کرائسس پر لکھی گئی کہانی 'تپتی زندگی گرھن' 'زنتھی' وغیرہ اس کی خوبصورت مثالیں ہیں۔

ڈاکٹر افسر کاظمی

انسان، سماج، مخلوقات کی وارداتِ قلبی یا کبسی خاص نقل و

حرکت کی ترجمانی کے عکس اور نقش کو افسانہ کہا جاتا ہے۔ افسانہ نگار اپنی مشاہدات کی بصیرت سے گزرتے اور بکھرتے لمحوں کو اپنی چشمِ دوربیں میں قید کر کے لسانی لباس میں سجاتا اور سنوارتا ہے۔ افسانہ نویس کا یہ عمل اسے شب بیداریوں کی تہجد گزاریوں کے صلے میں میسر آتا ہے۔اور یوں بھی اختر و شمس و قمر کی نیاز کی ثمر آوری کا مشاہدہ "گدہ" کے اوصاف و اطوار کے خوشے کی صورت میں سامنے آئے تو کیوں نہ کہا جائے کہ فکشن کی دنیا کا ابھرتا ہوا نوجوان استحکام کی منزلوں کو طے کرتے ہوئے اپنے اسلوب اور بیانیہ کی قدرت سے نہ صرف اپنی انے والی نسلوں کو مرعوب و متاثر کرتا رہے گا بلکہ اردو افسانے کی تاریخ میں نمایاں مقام کا استحقاق جتاتے ہوئے نیا سنگِ میل نصب کرنے کی سعادت حاصل کرے گا۔

حافظ محمد جہانگیر اکرم

"زبان و ادب" پٹنہ کے ماہ ستمبر ۲۰۱۲ء کے شمارہ میں اشاعت نیاز اختر (جمشید پور) کا افسانہ "تپتی زندگی" پڑھنے کا شرف حاصل ہوا۔ نیاز اختر کی تحریر بولتی تصویر ہے۔ ان کی تحریر کراہتی بھی ہے تو خوش آئند پیغام دیتی ہے۔ ان کی تحریروں میں صداقت کی لکیریں پوشیدہ ہیں، جس سے دل و ماغ پر فرط و انبساط کے آوازے دستک دیتے ہیں۔ کسی بھی تحریر سے خالق کی شخصیت کا تصور ابھرتا ہے اور اس کے مزاج کا پتہ چلتا ہیکہ کس طرح وہ سماجی عوامل کا حصہ دار ہے۔

تپتی زندگی ان ہی کوائف پر مبنی ایک دل کش افسانہ ہے جو

عوامی سطح پر روز مرہ کے مسائل آئے دن سر اٹھاتے رہتے ہیں۔ گرمی کی شدت اور پانی کی قلت پھر محکمہ آبی وسائل کے ناقص حالات انسانی زندگی کو مجروح کر دیتے ہیں۔ ایسا احساس ہوتا ہے کہ برائے طلب آب دو پہاڑیوں کے فاصلوں کی دوڑ لگانی پڑ رہی ہے اور اچانک آبشار پھوٹ پڑتا ہے جس سے ہر ذی روح کو راحت ملتی ہے۔ جیسے معجزہ ذبیح اللہ ہو۔

ضروریات کے لیے پانی حاصل کرنے میں کیسی خود غرضی ثابت ہوتی ہے وہ اس افسانہ کا بہترین حصّہ ہے۔ ضرورت مند اپنی پہلی باری کا دعویٰ کرنے میں ایک دوسرے کی بالٹی اور گھڑا کو پیچھے کر اپنے برتن کو مزید آگے سرکانے میں کامیابی کا لطف اٹھاتے ہیں لیکن یہ لطف جلد ہی کافور بن جاتا ہے۔ آپسی تصادم اور پھر چیخ وپکار کی فضا میں اصول و ضابطہ کی طنابیں ٹوٹ کر گر جاتی ہیں۔ ان ہی کیفیات کو ایک ضعیف العمر و نحیف فقیر اپنا کمنڈل لیے آگے بڑھتا ہے لیکن بے رحم لوگ اسے پیچھے کی طرف ڈھکیل دیتے ہیں۔ نمبر سے پانی ملنے کا اصول اور ضابطہ کا سبق سکھانے لگتے ہیں۔ بیچارہ فقیر پانی کی دھار کو پتلی ہوتے دیکھ اسے اپنی ہی زندگی کمزور نظر دھاگے کی طرح دکھائی دینے لگتی ہے۔ لیکن کسی کو بھی اس بوڑھے پر ترس نہیں آیا اور وہ بیچارہ فقیر پیاس کی شدّت کی تاب نہ لا کر زمین پر گر پڑا اور سدا کے لیے وہ پیاس سے نجات پا گیا۔

افسانہ کے اس حصّہ میں یزید کے کردار کی بو آتی ہے۔ جہاں سچائی بھی تصنّع سے کام لیتی ہے۔ بوڑھے کے مرنے کے بعد اصول و ضوابط سے لائن لگا کر پانی بھرنے والے لوگ اب اسکے منہ و چہرے پر بالٹی بالٹی پانی انڈیل رہے ہیں لیکن اس بوڑھے کی تشنگی تو قدرتی

طور پر کب کی مٹ چکی تھی۔ اسے گرم ریتیلی سخت دھوپ سے ہمیشہ کے لیے چھٹکارہ مل گیا۔ یہ افسانہ دراصل اس فکر کی نشاندھی کرتا ہے جس میں عام طور پر ذہنی استحصال، بے رحمی کا جذبہ اور اصول و ضوابط کے نام پر کسی کی حق تلفی کرنا ایک عام سا مزاج بن گیا ہے جس میں ہم سارے لوگ شامل ہیں۔

شکیل علائی

نیاز اختر ایک اچھے انسان ہیں۔ ان کو کہانیاں لکھنے کا گویا جنوں سا ہے۔ چھوٹی چھوٹی باتیں جو ہماری آنکھوں سے اوجھل ہوتی ہیں انہیں وہ اپنی کہانیوں میں جگہ دیتے ہیں۔ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ "بوڑھے برگد کا انت" کی اشاعت کے لیے دلی مبارکباد دیتی ہوں۔

عصمت آرا

آپ کی کہانی "رتھی" آج کے ناگفتہ بہ حالات میں انسانی رشتوں کی ترلتا اور بازار کی بد عنوانی سے پنپی جٹلتا کی کشمکش کی جیتی جاگتی مثال ہے۔ بازار واد کے اس دور میں جہاں بازار ہر پل انسان کے خاتمے کی کو تیار بیٹھا ہے۔ ہیلتھ ڈپارٹمنٹ میں بازار کی اسی بدعنوانی کی پول کہانی "رتھی" کھولتی ہے۔ جہاں مریض کے داخلے، اس کی مختلف جانچ وغیرہ سے لے کر اس کی انتم یاترا کے لیے رتھی (ارتھی) کا بھی انتظام ہے۔ سارا کچھ بازارواد کی شرطوں کے مطابق جہاں سب کا حصہ اور منافع پہلے سے طے شدہ ہے۔ کہانی کے سبھی کردار.... میں امیت بابو، ڈاکٹر، رتھی والا، دکاندار وغیرہ کی تصویر کشی قابل تعریف ہے۔ کرداروں کے

مقامی ڈائیلاگ کے استعمال نے انہیں امر بنا دیا۔

کمل

رنتھی کہانی میں زندگی کی سچائی بیان کی گئی ہے۔ اس کہانی کو پڑھتے ہوئے لگتا ہے کہ ہر ایک جملہ، ہر ایک منظر میں تخلیق کار خود کھڑا ہو جیسے۔ کہانی بیحد دل کو چھونے والی ہے۔ یہ کہانی ہیلتھ ڈپارٹمنٹ میں چل رہے گھوس خوری کو بھی درشاتی ہے۔ مگر ان سب کے بیچ کہانی انسانیت کا دامن ایک بار کے لیے بھی نہیں چھوڑتی۔ یہی اس کہانی کی کامیابی ہے۔

گجیندر کمار

نیاز اختر ایک اچھے افسانہ نگار ہیں۔ ان کی فن افسانہ نگاری پر اچھی دسترس ہے۔ ان کی کہانی ''گدھ'' پارسی کلچر اور آج کے بگڑتے ماحولیات کی عکاسی کرتا ہے۔ بوڑھے برگد کا انت بھی ایک اچھی کہانی ہے جو ایک ناول کا کینوس رکھتی ہے۔

محبوب عالم

نیاز اختر کو میں بچپن سے جانتا ہوں۔ یوں کہیے کہ نیاز میرا لنگوٹیا یار ہے۔ جس کے ساتھ میرا بچپن گزرا۔ شروع سے ہی یہ پڑھنے پڑھانے اور سننے سنانے میں شوقین رہے ہیں۔ میٹرک کے بعد یہ باضابطہ طور پر کہانی لکھنے لگے۔ انٹرنس کے بعد تو ان کی کہانیاں ملک کے مختلف پرچوں میں شائع ہونے لگیں۔ ان کی بیشتر کہانیاں میں نے

پڑھی ہیں۔ تپتی زندگی، گدھ، رنتھی، ٹرمینیٹر، سنبھالا، حقیقت وغیرہ ان کی بہترین کہانیاں ہیں۔ ان کہانیوں کو پڑھنے سے ایسا معلوم پڑتا ہے کہ نیاز کے اندر ایک اچھے تخلیق کار کے سارے گن موجود ہیں۔ ان کی کہانیوں میں زندگی کی تلخ سچائیاں جاننے کو ملتی ہیں۔" بوڑھے برگد کا انت" کے لیے میں انہیں دلی مبارکباد دیتا ہوں۔

منتشر عالم

■

نیاز اختر صرف ہم عمر ہی نہیں بلکہ ابتدائی دور میں ہم دونوں کے افسانے ساتھ ساتھ بھی آتے رہے ہیں۔ ادھر دو سالوں میں نیاز کے جو افسانے" آجکل، ایوان اردو، شاعر، ادب ساز، کسوٹی جدید، زبان وادب، پری کتھا (ہندی) میں شائع ہوئے ہیں ان میں گدھ، رنتھی اور گرھن کی خاصی پذیرائی ہوئی ہے۔ جھارکھنڈ کے بہترین لکھنے والوں میں اب ان کا شمار ہونے لگا ہے۔مجھے امید ہے کہ جب ان کے افسانوں کا مجموعہ" بوڑھے برگد کا انت" شائع ہوگا اور ایک ساتھ چھبیس افسانے پڑھنے کو ملیں گے تب ان کے افسانے کو ایک نئی پہچان ملے گی۔"

مہتاب عالم پرویز

نیاز کی کہانیوں میں تنوع ہیں۔ ان کی بیشتر کہانیاں اچھوتے موضوعات پر ہیں۔ جیسے گدھ، رنتھی، ٹرمینیٹر وغیرہ۔ ٹرمینیٹر کا موضوع ایسا ہے کہ اب تک کسی افسانہ نگار نے نہیں چھوا ہے۔

وسیم احمد

نیاز اختر قصہ گو ہیں کہانیاں سناتے ہیں۔افسانے نہیں گڑھتے ۔اس لیے انکی کہانی میں زبان کی وہ صورت نہیں دکھتی جو جدید اور ما بعد جدید افسانہ نگاروں کے ہاتھوں فن قصہ گوئی کی موت کا اعلان کرتی ہے۔ یعنی نیاز اختر کے یہاں داستان گو زندہ ہے اور قصہ گوئی باقی۔ سادہ سی زبان،سادہ سا انداز بیان او بہت سبک Narrative Methodology کے ساتھ نیاز اختر جب اپنا قصہ کہتے ہیں تو ایسا لگتا ہے کہ الگو چودھری اپنے کھلیان میں بیٹھا آگ سینک رہا ہے اور ہم سب اس الائو کے گرد بیٹھے خود سے بیخود ان کی کہانی کے اندر اترتے چلے جارہے ہیں۔انکی کہانیوں کا مجموعہ "بوڑھے برگد کا انت" عنقریب میرے ہاتھوں میں ہو گی۔ ایک دوست کی دلی خواہشات اس مجموعے کی کامیابی سے وابستہ ہے۔ لیکن اس سے بڑھ کر یہ کہ ادب کا ایک طالب علم ہونے کے ناتے ہم انکی کہانیوں کو پڑھتے ہوئے اپنے وقت اور سماج کے ساتھ روبرو ہوتے ہیں۔

یحیٰی ابراہیم

☆☆☆☆☆
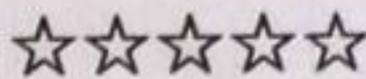
جمشید پور اور کہانی.........یہ دونوں لفظ میرے عشق کے دائرے میں آتے ہیں۔ نیاز اختر جمشید پور سے افسانے کی سطح پر اُبھرنے والا ایک نیا، کورا اور مضبوط نام ہے۔ نیاز اختر کے یہاں جمشید پور کی افسانہ نگاری کی روایت بھی ہے اور جدت کا احساس بھی۔ ان کے موضوعات نئے ہیں۔ موضوعات کو افسانہ کرنے کا فن ان کا اپنا ہے۔ لفظیات کے انتخاب نے ایک خاص تاثر، زور اور قوت ان کی کہانیوں کو عطا کی ہے۔ ان کی کہانی ''گدھ'' ہو یا ''زنخی''.....''بوڑھے برگد کا انت'' ہو یا ''گرہن''......کہانیوں کی زبان، انہیں استحکام بخشتی ہے۔ یوں بھی یہ کہانیاں سماج کی بہترین عکاس ہیں اور ان کے کردار سماج کے گوشت پوست کے انسان ہیں۔

نیاز اختر سے اردو دنیا کو بہت اُمیدیں ہیں۔ ان کے یہاں کہانی کا خام مواد، خاصا ہے۔ ان کے یہاں قصے ہیں، بس انہیں فن کی کسوٹی پر افسانہ بنانا ہے۔ روایت سے اپنا رشتہ استوار رکھنا ہے، علاقائی مسائل کو آواز عطا کرنا ہے۔ یہ کام وہ کر بھی رہے ہیں لیکن بہتر سے بہتر کا سفر ہمیشہ سرخروئی عطا کرتا ہے۔

میری دُعا ہے نیاز، جمشید پور کا نام روشن کریں اور واقعات و حادثات کو یوں ہی افسانہ کرتے رہیں۔

اسلم جمشید پوری

BUDHEY BARGAD KA ANT

by

Niyaz Akhtar

نیاز اختر گزشتہ پچیس برسوں سے لکھ رہے ہیں۔ ان کے افسانے روز و شب کے تخلیقی آئینے ہیں جن میں حیاتِ انسانی کے نشیب و فراز، نفسیات و کیفیات اور احساسات و جذبات کے عکس نظر آتے ہیں۔ ان کے یہاں بیانیہ سادہ مگر پُرکار، کردار متحرک اور مکالمے فطری انداز میں پیش کیے گئے ہیں۔ بوڑھے برگد کا انت نیاز اختر کی پہلی سنجیدہ کاوش ہے۔ میں توقع کرتا ہوں کہ ان کا تخلیقی سفر نئی منزلوں کو سر کرے گا۔

(پروفیسر) اقبال حسن آزاد، مونگیر

نیاز اختر کی کہانی پڑھ کر مجھے خوشگوار حیرت کا احساس ہوا۔ مکالموں اور پلاٹ پر نیاز اختر کی اچھی دسترس ہے اور تکنیک کے اعتبار سے بھی یہ کہانیاں قابل ذکر ہیں۔ میں نیاز اختر کو مستقبل کے بہت اچھے کہانی کار کی حیثیت سے مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

(پروفیسر) خالد جاوید، دہلی

نیاز اختر اپنے سماج کی نبض کو پڑھنے کا شعور اور اپنے ماحول کی دھڑکنوں کے لکھنے کا سلیقہ جانتے ہیں۔ روزمرہ کے واقعات کے تانے بانے سے افسانہ بُننے کا ہنر انھیں معلوم ہے۔ اور بُناوٹ کا سب سے بڑا حسن ہے اس کی سادگی۔

(پروفیسر) احمد بدر، جمشید پور

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE

www.ephbooks.com